

مولانا تقی امینیؒ اوران کی فقہی خدمات

تلخیص

برائے

پی. ایچ. ڈی

مقالہ نگار
جاوید احمد خاں
ریسرچ اسکالر شعبۂ دینیات (سنی)

نگراں
ڈاکٹر عبدالخالق
(چیرمین)

شعبۂ دینیات (سنی)
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۱۲ء

تلخیص

علم فقہ علوم شرقیہ میں بڑی اہمیت کا حامل علم ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظر حدیث شریف میں آتا ہے۔ **من أرادالله به خيراً يفقّههُ فى الدين** [صحیح البخاری کتاب العلم]

یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اس کو فقہی بصیرت یعنی دین کی گہری سمجھ عطا فرماتا ہے۔

اس کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اسے فرض کفایہ قرار دیا ہے۔چنانچہ فرمایا:

فلو لا نفرا من كلا فرقة منهم طائفةٌ ليتفقهو افى الدين و لينذرو اقومهم اذا رجعوا اليهم لعلّم يحذرون [التوبہ/۱۵۴]

حالانکہ آج کل لوگوں نے لفظ فقہ کے مفہوم میں خصوصیت پیدا کر لی ہے اور اب فقہ دینی مسائل کے جزئیات کو دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہوکر رہ گیا ہے مگر آیت مذکورہ میں فقہ کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جہل وغفلت کے نتائج سے لوگوں کو باخبر کرنا اور انہیں برائیوں سے بچنے کی تلقین کرنا ہے۔دوسرے لفظوں میں اس کا مقصد قلب و دماغ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے جس سے حالات و مسائل کا صحیح تجزیہ کیا جاسکے اور معاملات کی گہرائی تک پہنچا جاسکے اور لوگوں کو ہشیار اور باخبر کیا جاسکے اس کے بغیر فقہ کا مقصد پورا نہیں ہوسکتا۔اس بات کی وضاحت امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں اس طرح کی ہے :

''فقاہت حاصل کرنے کا مقصد قرآن حکیم میں ''**لينذرو اقومهم**'' بیان کیا گیا ہے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ صدر اول کی فقہ پر عمل درآمد نہ ہو۔طلاق، عتاق، لعان وغیرہ فروعی مسائل سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوسکتا ہے بلکہ بسا اوقات صرف انہی

مسائل کی طرف توجہ دل کو سخت بنا دیتی ہے۔اور خوف الٰہی جاتا رہتا ہے۔جیسا کہ ہم اپنے زمانہ کے ایسے مفتیوں میں مذکورہ باتیں دیکھ رہے ہیں کہ ان کا دل سخت ہو چکا ہے اور خوف خدا رخصت ہو گیا ہے۔ [الغزالی، احیاء علوم الدین ج/۱]

اس مقالہ میں فقہ کے اس مقصد کو پھیلا کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ جس کا نام ''مولانا تقی امینیؒ اور ان کی فقہی خدمات'' ہے درج ذیل عناوین پر مشتمل ہے۔

۱- مقدمہ

۲- باب اول مولانا محمد تقی امینیؒ حیات وسیرت۔

۳- باب دوم مولانا تقی امینیؒ کی تالیفات ایک نظر میں۔

۴- باب سوم فقہ کی اہمیت تاریخ اور اس کا آغاز وارتقاء۔

۵- باب چہارم مولانا تقی امینیؒ کی فقہی خدمات۔

باب اول میں مولانا کی حیات وسیرت پر گفتگو کی گئی ہے جس میں نام، تاریخ پیدائش، حلیہ، تعلیم، اساتذہ ومشائخ، تدریسی خدمات نیز دیگر دینی وملی خدمات سے لے کر آپ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس میں بطور خاص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں آپ کی علمی اور تدریسی خدمات کے مختلف گوشوں کو واضح کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں آپ کی مختلف علمی، دینی، دعوتی اور فقہی نیز حدیثی مضامین پر مشتمل کتابوں پر ایک نظر ڈالی گئی ہے اور اس کی افادیت نیز موجودہ دور میں ان کی ضروریات کو واضح کیا گیا ہے جن کتابوں پر کلام کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

اسلام کا زرعی نظام، کائنات میں انسان کا مقام، عروج وزوال کا الٰہی نظام، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، تہذیب کی تشکیل جدید، انشورنس کی شرعی حیثیت، حدیث کا درایتی معیار، اسلام اور جدید دور کے مسائل، حکمت

القرآن، مراسلات وغیرہ۔

ان کتابوں کا نہ صرف خلاصہ بیان کیا گیا ہے بلکہ ان کے علمی وافادی پہلوؤں نیز عہد حاضر میں ان کی اہمیت اور ضرورت کو بطور خاص واضح کر کے پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا باب فقہ کی اہمیت اس کی تاریخ اور آغاز وارتقاء کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے اس باب میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں فقہ کے وسیع ترین مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح علم فقہ میں انحطاط کا عمل شروع ہوا اور یہ چند محدود مباحث میں سمٹ کر رہ گئی اور صدر اول میں اس کا کیا مفہوم ہوا کرتا تھا۔

فصل دوم میں فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں فقہی ارتقاء کا مفہوم، اس کی تاریخ، مختلف مراحل فقہیہ، اختلاف فقہاء کے اسباب، مختلف مراکز فقہیہ کا قیام، مختلف مکاتب فقہیہ کے اہم نمائندوں کا تعارف، تدوین فقہ کی ضرورت اور اس سلسلہ کا سابقہ کام، ظہور تقلید اور عہد تقلید کے علمی کام مثلاً شرح، تخریج، تدوین اور تعلیل وغیرہ مختلف مصطلحات فقہیہ فقہ کا تاریک پہلو جس میں مناظرات ومجادلات کی کثرت، تائید مذاہب کے لیے وضع حدیث، مناظرہ کی آفتیں، تعصّبات مذہبی وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھا باب جو دراصل مرکزی موضوع پر مشتمل ہے اس کا عنوان ہے مولانا تقی امینیؒ کی فقہی خدمات ہے اس باب میں مولانا کی فقہی خدمات پر چار مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی گئی ہے۔

مولانا کا پہلا کام تو قانون اسلامی کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کا ہے مولانا کے پیش نظر فقہ اسلامی کی اس طرح ترتیب وتدوین کا کام تھا جو عہد حاضر کی قانونی ضروریات کو پوری کر سکے اور اگر اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو ہماری فقہ نئے عہد ومزاج کا ساتھ دے سکے۔ اس کی ضرورت کا احساس تو ہمارے اکابرین کو بہت پہلے سے تھا مگر اس کی پیچیدگیوں کے پیش نظر انہوں نے اس بڑے پتھر کو صرف چوم کر چھوڑ دیا تھا مگر مولانا نے نہ صرف اس پہلو پر غور کیا بلکہ اس کے خدوخال بھی

متعین کیے اور بہت سے موجودہ عہد کے مسائل کو حل کر کے بھی دکھایا۔

دوسرا پہلو مولانا کی فقہی خدمات کا یہ ہے کہ وہ اس مردہ امت میں اجتہاد کی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس امت مرحومہ کا خاص وصف و امتیاز روح اجتہاد ہے جو ایک مدت سے اس کے جسم میں سرد پڑ چکی ہے وہ اسے تازہ کرنا چاہتے تھے اور اسے ایک بار پھر اس مقام و مرتبہ پر فائز دیکھنا چاہتے تھے جہاں سے وہ دنیا کی امامت و پیشوائی کا فریضہ انجام دے سکے۔

مولانا کی فقہی خدمات کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ وہ شریعت کو بے لچک نہیں مانتے تھے۔ ان کا یقین واذعان تھا کہ یہ شریعت رہتی دنیا تک کی رہنمائی کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شورائیت کی روح اس کا اصل مزاج ہے اور ہر عہد و زمانہ کے لحاظ سے اس کی فقہی قوانین میں ترمیمات کی جاسکتی ہیں جس کی واضح مثالیں خود حضورؐ کے فیصلوں اور خلافت راشدہ کے عہد میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ یہی مزاج ہر زندہ قانون کا ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ قانون زمانہ کے بدلتے ہوئے مزاج اور ذہن کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مولانا کی نگاہ شریعت اسلامی کے اس کے پہلو پر بطور خاص تھی وہ ان علماء میں سے نہ تھے کہ ایک ذرا زمانہ کا مزاج بدلا اور وہ تکفیر و تفسیق کے فتووں سے لیس ہو کر آن وارد ہوئے۔ شریعت کے اس پہلو کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے احکام شریعت میں حالات و زمانہ کی رعایت نامی کتاب لکھی اور اس پہلو کو بالکل واضح کر کے دکھا دیا۔

مولانا کی فقہی خدمات کا چوتھا اور آخری پہلو جدید پیش آمدہ مسائل میں شریعت کے اشارات دلالات اور اقتضاءات سے کام لے کر ان مسائل کے تنقیح کی تھی ان مسائل میں ملکیت آراضی، رویت ہلال، جدید مالیاتی مسائل مثل بینکوں، پوسٹ آفسوں اور سیکولر حکومت کے ساتھ سودی معاملات اور مفاہمت بین المذاہب وغیرہ کے مسائل ہیں۔

یہ مولانا کی فقہی خدمات اور دینی بصیرت کے ابھرے ہوئے پہلو ہیں۔ ان مسائل پر سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لیے اکیڈمیاں اور علمی ادارے کام کرتے ہیں مگر حیرت انگیز معاملہ ہے

کہ مولانا نے تن تنہا یہ کام کر کے دکھا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا گروہ علماء وفقہاء میں ایک ممتاز اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں میں یہ بات برملا کہنا چاہتا ہوں کہ میں انے اپنی حد تک اس موضوع کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر اس مقالہ کی حیثیت بارش کے اس پہلے قطرہ کی ہے جو موسم کی آمد کا اعلان کرتا ہے اور زمین کو اپنی پہلی نمی عطا کرتا ہے سوکھی زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور بعد کی بارش کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ یقیناً اس موضوع پر اور بھی کام کرنے کی ضرورت اور گنجائش ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری یہ کوشش اس موضوع کو اٹھانے کی پہلی کڑی ثابت ہوگی اور انشاء اللہ ثم انشاء اللہ میرا یہ کام طبقہ علماء کے محققین کے لیے مہمیز ہوگا اور وہ اس پہلو پر زیادہ بہتر انداز میں داد تحقیق دے سکیں گے اور عصر حاضر کے فقہی مزاج کو سمجھ کر مولانا کے اٹھائے ہوئے سوالات پر غور کریں گے اور اس کا جواب پانے کی کوشش کریں گے کہ زندہ امتوں کا یہی مزاج ہوتا ہے ع

کہ یہی ہے امتوں کے مرض کہن کا چارہ

شعبۂ سنّی دینیات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲
Dr. Abdul Khalique
Chairman



DEPARTMENT OF SUNNI THEOLOGY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH – 202002

Ph. No. 0571-2701166, Int. 1780

Certificate

Certified that **Mr. Jawed Ahmad Khan,** En. No. BB-1498 a research scholar in the Department of Sunni Theology, Aligarh Muslim University, Aligarh has completed his research work entitled:

"مولانا تقی امینیؒ اور ان کی فقہی خدمات"

(Maulana Taqui Amini Aur Unki Fiqhi Khidmaat)

the work embodying the findings, result of investigation, is conducted under my supervision. It is original work suitable for submission for the award of Ph.D. Degree in Sunni Theology.

Dr. Abdul Khalique
Chairman

17/8/12

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمدللہ رب العالمین الذی علم الانسان بالقلم ، علم الانسان مالم یعلم والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہٖ الکریم، خاتم النبین، سید المرسلین ، محمدن الامین و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین و من تبعھم بأحسانٍ الیٰ یوم الدین

تمام حمد اور کل شکریہ کا مستحق وہ اللہ رب العزت کی ذات عالی ہے جس نے انسان کو علم کے زیور سے آراستہ کیا اور قلم کے ذریعہ اسے علم سکھایا اور درود وسلام ہو سید الانبیاء، خاتم النبین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اہل وعیال اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر اور آپ کے ان تمام متبعین پر جنھوں نے خلوص قلب اور نیک نیتی کے ساتھ آپؐ کی پیروی کی۔ ہزار ہا درود وسلام ابدالآباد تک۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد عرض ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان سے آج تقریباً چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد رب کریم نے یہ موقع عنایت فرمایا کہ میں نے اپنا Ph.D کا مقالہ بعنوان ''مولانا تقی امینی اور ان کی فقہی خدمات'' مکمل کر سکا۔ جو ایک طرح سے میری آج تک کی تعلیمی زندگی کا حاصل ہے۔

عام طور پر شخصیات اور ان کے کارناموں پر لکھنے کو تحقیق کے میدان میں دوسرے درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شخصیات پر کام تو تقریباً ہو چکا ہوتا ہے اور مذکورہ شخصیت کے کاموں کو بس ایک نظر دیکھ کر ادھر ادھر سے اقتباسات جمع کر دینا ہے اور اٹھائے کچھ ورق لالہ

نے کچھ گل نے کے مصداق کام مکمل ہو جائے گا۔ ایسے لوگوں سے نہایت معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ شخصیات پر لکھنا آسان کام ہرگز نہیں ہے کیونکہ آپ کسی بھی شخصیت پر اس وقت تک کچھ لکھ ہی نہیں سکتے جب تک آپ خود اس کی شخصیت میں جذب نہ ہو جائیں۔ اس کے فکری مواد، اس کی ذہنی اپچ اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے ذاتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور علمی عہد کے کمالات کا احاطہ آپ نہ کر سکتے ہوں اور ایسی شخصیات پر لکھنا تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے جن کے بارے میں پہلے کچھ لکھا ہی نہ گیا ہو۔ اور کسی قلم کار نے اس شخصیت کو اپنے قلم کا موضوع ہی نہ بنایا ہو۔

بدقسمتی سے ابتدا میں مجھے اس موضوع کی صعوبتوں کا بالکل ہی اندازہ نہ تھا۔ بس ایک جوش، ایک خروش، کام کرنے کی لگن اور مولانا کی شخصیت کا طلسم ذہن پر ایسا چھا گیا تھا کہ کسی اور پہلو پر سوچنے اور سمجھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ لیکن جب کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ مطالعہ بڑھتا گیا تو اوپر کی پرتیں چھٹتی چلتی گئیں اور منظر نامہ واضح ہوتا گیا میرے لیے مشکل یہ تھا کہ میں فقہ کا اسکالر نہیں تھا اس لیے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے علمی مواد کو پرکھنے میں بڑی جانفشانی کرنی پڑی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی اس کمزوری کو اپنے پہلے نگراں مقالہ کو نہ سمجھا سکا۔ ادھر محترم موصوف کے پاس بھی وقت کی قلت تھی اور ان کا رٹائرمنٹ کا وقت بھی آ گیا تھا اس لیے معاملہ بیچ منجدھار میں پھنس گیا اور میں ذہنی طور پر بہت شکستہ ہو گیا۔ مگر شکر و احسان ہے اس مالک کا جس کے سہارے میں نے اس موضوع کا بیڑا اٹھایا تھا کہ اُس نے میرے شعبہ کے چیئرمین جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کے دل میں میرے لیے رحم کے جذبات پیدا کر دیئے اور انہوں نے اس مشکل موقع پر میری یاوری فرمائی اور اس طرح یہ سفینہ موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا ساحل مراد پر آن لگا۔

یہ موضوع میرے لیے دلچسپی کا باعث یوں بنا کہ دراصل مولانا تقی امینیؒ کی شخصیت ہی میں بڑی کشش تھی۔ ان کی علمی شخصیت نہ در نہ تھی وہ ہمارے شعبۂ دینیات کے صدر عالی قدر بھی ہوا

کرتے تھے اور علم فقہ میں ان کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ اور آج ان کی شخصیت کے طویل مطالعہ کے بعد میں ان کے بارے میں یہ بات علی الاعلان کہہ سکتا ہوں کہ معاصر ہندوستان میں کم ہی ایسی شخصیات ہوں گی جنھوں نے فقہی موضوعات پر اس قدر پھیل کر سوچا ہے۔ ان کی شخصیت غالب کے بقول ایک عندلیب گلشن نا آفریدہ کی تھی۔ ان کی شخصیت کا اگر اندازہ لگانا ہو تو یہ میرا پورا مقالہ اس کا شاہد عدل ہے لیکن یہاں صرف نمونہ کے طور پر اس کا ایک پہلو پیش کرتا ہوں۔ عام طور پر فقہ کی تعریف آج کل یوں کی جاتی ہے کہ مسائل کو اس کی تفصیلی دلائل کے ساتھ معلوم کرنے کا نام فقہ ہے۔ مگر مولانا کے نزدیک یہ ایک محدود اور غیر متوازن تعریف ہے۔ ان کے نزدیک دین میں گہری بصیرت اور اسلامی نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد اور کلمۃ اللہ کے اعلاء کی تڑپ اور اس کے لیے تگ ودو یہ ساری چیزیں فقہی بصیرت کے ضمن میں آتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک صرف وضو اور نماز کے مسائل یا نجس وناپاک چیز کنویں میں گر جانے کی صورت میں کتنے ڈول پانی نکالنے سے پانی پاک ہو جاتا ہے جیسے مسائل کی واقفیت ہی فقہ کا موضوع نہیں ہے بلکہ اصلی فقاہت یہ ہے کہ فقہی قوانین اور اسلامی دستور کو من حیثیت الکل جاری و نافذ کرنا اراس کے لیے اپنے عہد کے حالات کو سمجھنا بحیثیت دستور اس کے اولیات اور تقدمات نیز تأخیرات و تاجیلات کا جائزہ لینا، قانون کی تدوین جدید، اجتہاد و استنباط، تفریع غور و فکر اور موجودہ عہد کی ضرورتوں کو الٰہیات اسلامی کی روشنی میں حل کرنا ہی دراصل فقیہ یا مجتہد عصر کا کام ہوتا ہے۔ اور فقہ کی انہی کاموں کی تفصیل و توضیح ان کی پوری زندگی کا مقصد رہا۔ ان کی کتابوں میں اسلام کا زرعی نظام، اسلام اور جدید دور کے مسائل، مسئلہ اجتہاد کا تحقیقی جائزہ، فقہ اسلامی کی تاریخ وغیرہ کا موضوع یہی رہا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مولانا نے بعض ایسی چیزوں کی بھی توضیح فرمائی ہے جو آج کے زمانہ کے لیے فقہی اعتبار سے ضروری لیکن نسبتاً غیر واضح تھیں مثلاً، نسخ، اجتہاد، نظام اسلامی کی تشکیل میں پیش آنے والی علمی رکاوٹیں وغیرہ اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی چیزیں جو اس کتاب کے چوتھے باب میں پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کی

گئی ہیں۔

مولانا کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا قاری بخوبی جانتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی کوئی بھی بات بے دلیل نہیں کہتے تھے اپنے ہر ہر جزئیہ کے لیے ان کے پاس دلائل ہوتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں اگر کہا جائے تو وہ خود سے کوئی بات کہتے ہی نہیں تھے بلکہ وہ اپنی بات اسلاف محققین کی زبانی کہتے تھے اور انہی کی باتوں سے اپنے لیے تائید کے پہلو نکالتے تھے۔ اور اس زمانہ میں علم و عقل کا جو معیار ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ اپنی ہر بات کے لیے اسلاف کی کتابوں سے دلائل فراہم کرنا بڑے بڑوں کے بس کی بات نہیں۔

یہ دراصل مسلم یونیورسٹی اور بالخصوص شعبۂ دینیات کے لیے بڑی خوش نصیبی تھی جسے مولانا مرحوم جیسا متبحر عالم دین اور فقہی بصیرت رکھنے والا صاحب قلم ملا۔ وہ ایک عالم باعمل اور کوہ وقار تھے۔ ان کی شخصیت نے شعبۂ دینیات کے نام کو سر بلند کیا۔ یہ شعبہ پر ان کا حق تھا کہ ان کی شخصیت پر تحقیق کی جائے اور اس طرح ان کو ان کا جائز حق مل سکے۔

سو یہ میری خوش قسمتی ہے کہ یہ سنہرا موقع مجھے ملا۔ اور میں نے اپنی تمام تر کوتاہیوں اور کم علمی کے باوجود اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ؎

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

یہ مولانا کی شخصیت کی بلندی ہی ہے جس کی وجہ سے مجھ جیسا ناچیز طالب علم بھی ان سے فیضیاب ہوسکا اور ان کے نام کی برکت سے مجھے بھی تحقیق و ریسرچ کا شرف حاصل ہوسکا۔ اس کے لیے میں شعبۂ دینیات کے سربراہ کا مشکور و ممنون ہوں اور بڑی ناسپاسی ہوگی کہ اگر اس موقع پر میں ایسے کچھ ناموں کا تذکرہ نہ کروں جن کی علمی، ذہنی اور مادی تعاون اگر مجھے حاصل نہ ہوتا تو آج ہمارا یہ مقالہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔

میں ممنون کرم ہوں اپنے والدین مکرمین کا جن کی شبانہ روز جدو جہد کے نتیجہ میں میں اپنے اندر یہ حوصلہ پاسکا کہ مادی کشاکش کی اس وسیع وعریض دنیا میں دینی اور خالص علمی کام کے لیے خود کو فارغ کر سکا اور میں نیک کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا اور میں ممنون ہوں اپنے تمام بھائیوں اور بہنوں کا و دوست واحباب کا، ساتھ ہی میں اپنی اہلیہ فرزانہ پروین کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ہر مشکل وقت میں ہمارا ساتھ دیا۔ اوراس طرح میں اس علمی کام کے لیے ذہنی طور پر یکسو ہوسکا۔

میں احسان مند ہوں اپنے نگراں اول جنابہ ڈاکٹر عبدالاحد صاحب کا جنہوں نے بڑی حد تک اس علمی کام میں میرا سہارا بننے کی کوشش کی اور میں نے ان سے علمی استفادہ کیا۔

میں بصمیم قلب شکر گزار ہوں اپنے موجودہ نگراں مقالہ صدرِ محترم جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا جنھوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ میرے رکے ہوئے اسکالر شپ کا اجراء کروایا اور اس وقت جب میں تھک ہار کر حوصلہ چھوڑ بیٹھا تھا میری حوصلہ افزائی کی اور منزل تک پہنچنے میں میری مدد اور رہنمائی کی۔ جناب ڈاکٹر مفتی زاہد علی خاں صاحب بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے بصمیم قلب میری مدد اور رہنمائی فرمائی۔ اور آگے بڑھنے میں حوصلہ افزائی کی۔

میں سراپا تشکر و امتنان ہوں اپنے ان مشفق اساتذہ کرام کا جنھوں نے قدم قدم پر میری علمی مدد فرمائی اور نہایت کم وقت میں مقالہ کو دیکھا اور اس پر اپنی گرانقدر آراء کے ذریعہ میری علمی رہنمائی کی بالخصوص ڈاکٹر محمد سلیم صاحب قاسمی، ڈاکٹر محبوب الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر احسان اللہ فہد صاحب فلاحی اور دیگر اساتذہ کرام کا جو بمنزلہ میرے روحانی باپ کے ہیں اور جو میری ترقی و کامیابی سے خوش اور میرے لیے دعا گو ہیں۔

رفقاء میں جن حضرات سے علمی رہنمائی ملی ان میں سرفہرست برادر محترم جناب جاوید احسن فلاحی مدنی صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے محترم لائبریرین جناب ابرار اشرف صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کتابوں کے انتخاب اور ان کو نکالنے میں ہماری مدد فرمائی۔ نیز

ہمارے نائب لائبریرین برادرم اشتیاق صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے کتابوں کی فراہمی میں تعاون فرمایا۔

اس مقالہ کی تیاری کے درمیان میں جن منبع علوم یعنی لائبریریوں سے فیضیاب ہوا وہ ہیں مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبۂ دینیات کی لائبریری، شعبہ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی لائبریری، رضا لائبریری رام پور اور خدا بخش لائبریری پٹنہ نیز موجودہ مدرسہ امینہ واقع کشمیری گیٹ دہلی کی لائبریری کا جہاں مولانا مرحوم درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وغیرہ۔

آخر میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس ناچیز کاوش کو قبول فرمائے اور ان تمام لوگوں نے جنہوں نے اس کام میں میرا کسی طرح بھی مدد وتعاون کیا ہے ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور انہیں اجرات حسنہ سے نوازے۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب انہ نعم المولیٰ و نعم النصیر ۔

خاکسار

جاوید احمد خاں

جاوید احمد خاں

شعبہ دینیات سنی

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مورخہ : ۱۵/اگست ۲۰۱۲ء

باب اول

مولانا محمد تقی امینی حیات وسیرت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد تقی امینی حیات وسیرت

مولانا محمد تقی امینی کا شمار ہمارے عہد کی ان برگزیدہ وچیدہ شخصیات میں ہوتا ہے جو علم کے اس قحط الرجال میں ماہ وانجم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کے علمی اور تحقیقی مقالات ،تقریریں اور مختلف قسم کی قومی خدمات میں ان کی مشارکت وغیرہ ان کو اپنے عہد کا ایک ممتاز اور وقیع شخصیت باور کراتی ہیں۔ ان کی ہشت پہلو شخصیت کی تعریف وتعارف ہمارے اس باب کا موضوع ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ان کی شخصیت کے چند بنیادی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

نام مقام اور تاریخ پیدائش:

آپ کا نام محمد تقی تھا اور والد محترم کا نام عبدالحلیم تھا آپ کی پیدائش یو پی کے صدر مقام لکھنؤ سے قریب ضلع بارہ بنکی کے قصبہ (سبیحہ (Subiha) میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش ۵رمئی ۱۹۲۶ء مطابق ۲۲رشوال ۱۳۴۴ھ ہے آپ کا تعلق معاشی لحاظ سے متوسط بلکہ نسبتاً غریب خاندان سے تھا والد صاحب پیشہ کے اعتبار سے ایک معمولی تاجر تھے اور ان کی نہایت محدود آمدنی میں سارے خاندان کا گذر بسر ہوتا تھا۔

حلیہ اور لباس:

آپ کا قد میانہ اور رنگ سانولا تھا چہرہ بیضوی اور رعب دار تھا، کرتا، پاجامہ اور شیروانی آپ کا عام لباس تھا۔

تعلیم:

مولانا کا خاندان ایک سیدھا سادہ مذہبی خاندان تھا، مذہبی تعلیم سے اسے خاص لگاؤ تھا چنانچہ ان کے والد صاحب نے انہیں دینی تعلیم حاصل کرنے کی رغبت دلائی اور گاؤں سیہجہ ہی میں واقع ایک مدرسہ میں داخل کردیا جو ایک مسجد میں چلتا تھا جہاں آپ نے ناظرہ قرآن مجید اور دیگر ابتدائی کتابیں پڑھیں اور جیسا کہ کہاوت ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ابتدا ہی میں آپ کے اساتذہ کو آپ کی ذہانت اور تعلیم کے تئیں آپ کے شوق اور ذہانت کا اندازہ ہو گیا چنانچہ اساتذہ کرام ہی کے اشارہ پر آپ کو حفظ قرآن مجید کے لیے بیٹھا دیا گیا اس طرح آپ چند سالوں میں نہ صرف حفظ قرآن سے فارغ ہو گئے بلکہ تجوید وقرآت اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں اور اس طرح آپ نے اپنے گاؤں میں موجود مدرسہ کے علمی معیار کی آخری منزل تو مکمل کرلی مگر علم کی پیاس مزید بڑھ گئی اب سوال پیدا ہوا کہ اس تشنگی علم کی تکمیل کہاں سے کی جائے چنانچہ کافی غور وخوض کے بعد شہر کانپور میں واقع مدرسہ جامع العلوم میں داخلہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا جو نہ صرف لکھنؤ سے قریب تھا بلکہ اس زمانے کے منہج کے مطابق درس نظامی کے طریقہ پر تعلیم بھی وہاں ہوتی تھی۔ مولانا رقمطراز ہیں۔

''ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں دو بزرگوں سے زیادہ اثر قبول کیا صوفی افضل علی صاحب اور قاری محمد یامین صاحب یہ دونوں حضرات حضرت مولانا تھانوی سے بیعت تھے (ضلع بارہ بنکی) کے مدرسہ میں ابتدائی تعلیم وتربیت انہیں دونوں بزرگوں سے حاصل کی اور اصلاً انہیں کی پرخلوص محبت نے تعلیمی دشواریوں کو آسان بنادیا۔ پھر اس کے بعد استاد محترم علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب کے تفقہ فی الدین، استغناء اور کردار کی بلندی سے متاثر ہوا، فراغت کے بعد متعین طور پر کسی ایک شخصیت کا نام لینا مشکل ہے جس اہل علم کا جو کام ابھرا ہوا نظر آیا اس سے استفادہ کی کوشش کی [۱]

مدرسہ جامع العلوم کانپور سے فراغت کے بعد تکمیل علم کے لیے آپ نے دہلی کا سفر کیا اور طالب علمانہ زندگی کا آخری پڑاؤ مدرسہ امینیہ دہلی میں ڈالا جو آج بھی کشمیری گیٹ دہلی میں موجود

ہےاور جہاں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم جیسے اساتذۂ فن اور جہاں دیدہ عالم موجود تھے۔ وہاں آپ نے تفسیر اور فقہ وحدیث میں تکمیل کا درجہ پاس کیا اور سند فضیلت حاصل کی، مدرسہ امینیہ دہلی کے داخلہ رجسٹر میں آپ کا اندراج نمبر ۱۷۹۵ ہے۔ یہاں آپ کامل ایک سال تک طالب علم رہے۔ یہاں پر آپ ۲۲/ شوال المکرّم ۱۳۶۴ھ مطابق ۴۶-۱۹۴۵ سے ۱۸/ شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ تک رہے [۲]

مدرسہ امینیہ میں آپ کے ساتھ تکمیل کرنے والے بعض طلباء کے نام یہ طرح ہیں:

(۱) محمد دوستان ولد رحمت اللہ خاں کیمل پور پنجاب (۲) غلام جیلانی ولد عبدالکمال چترال مالاکنڈ (جواب پاکستان میں واقع ہے) (۳) عبدالرحیم ولد عبدالحکیم (۴) محمد عمران ولد میر اکبر (۵) مظہر الاسلام بن مولانا عبدالحق ضلع چٹگام بنگال (۶) فتح محمد بن حافظ اسماعیل ساکن علی پور ضلع سورت گجرات وغیرہ۔

یہاں پر یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ مولانا اپنے نام کے ساتھ امینی کا جو لاحقہ لگاتے تھے یہ نسبت ذو معنیٰ تھی عام طور پر لوگ اس کی نسبت امینیہ کی طرف سمجھتے ہیں جیسا کہ قاسمی، فلاحی، اصلاحی اور ندوی کا لاحقہ ہوتا ہے اور یہ اس مدرسہ کی طرف نسبت ہوتی ہے جس سے طالب علم فارغ ہو کر نکلتا ہے مگر مولانا اس کی نسبت امانت کی طرف کرتے تھے گویا یہ علم مولانا کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ایک امانت تھا جسے وہ اس کے بندوں تک، پہونچانے کے امین تھے اس سے علم کے تئیں مولانا کی متانت اور سنجیدگی جھلکتی ہے۔ چنانچہ مولانا محترم کی کتابوں کے عربی ناشر اور مراجع ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مولانا کے تعارف میں فرماتے ہیں:

واتم تحصيله وحصل علىٰ شهادة التخرج من المدرسة الامينيه فى دلهى ومن هنا ظن بعض الناس ان كلمة الامينى نسبة الىٰ هذه المدرسة لكن الحقيقة ان هذه الكلمة صفة تعود الىٰ الامانه بصفة عامة [۳]

اساتذہ ومشائخ:

کسی بھی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کرداراس کے اساتذہ اورشیوخ کا ہوتا ہے،خوش قسمتی سے مولانا مرحوم کو ابتدا ہی سے بہت مخلص اور باصلاحیت اساتذۂ کرام کی رہنمائی نصیب ہوگئی جنھوں نے ان کی شخصیت میں رسوخ اور علمی پختگی پیدا کردی۔ابتداء میں تو صوفی افضل علی صاحب اور قاری محمد یامین صاحب نے اس علمی پودے کی آبیاری کی اور آخر میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب شاہجہاں پوری مرحوم سے انھوں نے استفادہ کیا جنھوں نے اپنے اس ذہین طالب علم کی نہ صرف علمی رہنمائی فرمائی بلکہ تربیت،استغناءاور کردار کی بلندی کے جوہر بھی عطا فرمائے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی

ان اساتذہ کے علاوہ چنداوراساتذہ کے نام یہ ہیں تفسیر میں آپ کے استاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا محمد عثمان صاحب تھے تحصیل حدیث مولانا عبدالحق صاحب سے کی اور فقہ آپ نے مولانا حبیب اللہ صاحب سے پڑھی۔

تدریسی خدمات:

مولانا تقی امینیؒ کی زندگی کا جو پہلو سب سے ابھرا ہوا ہے وہ ان کی تدریسی خدمات کا پہلو ہے اور جس کے لیے آپ نے اپنے نام کے ساتھ امینی کا لاحقہ منتخب فرمایا تھا۔چنانچہ مدرسہ امینیہ سے فراغت کے بعد آپ نے اپنے لیے درس وتدریس کا میدان کارہی منتخب فرمایا اور سب سے پہلے دہلی میں واقع ایک درسگاہ مدرسہ سبحانیہ سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز فرمایا اور وہاں درجہ عالیہ میں تفسیر،حدیث اور فقہ وغیرہ کی کتابیں آپ کے ذمہ کی گئیں یہاں آپ نے پوری محنت اور لگن کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کیں اور طلبہ وذمہ داران پر آپ کا اچھا اثر رہا مگر یہ مدت ملازمت غالبًا ایک سال سے زاید وسیع نہ ہوسکی اور آپ نے اس مدرسہ کو خیر باد کہا۔اور اپنے وطن سیہیہ واپس

آ گئے۔ سیجہ میں بھی خالی بیٹھنا آپ کو کب گوارا ہوسکتا تھا چنانچہ کانپور کا سفر کیا اور مدرسہ جامع العلوم میں جہاں آپ نے وسطیٰ درجہ تک تعلیم حاصل کی تھی اسی مدرسہ میں تعلیمی خدمت پر مامور ہوئے یہاں بھی آپ نے اپنی تعلیمی خدمات سے طلباء کا دل موہ لیا مگر بہت جلد ہی اس مدرسہ کو بھی خیر باد کہنا پڑا پھر مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں چند مہینے گزارنے کے بعد آپ کی تدریسی زندگی کے اگلے پڑاؤ کا قرعۂ فال مدرسہ ثانویہ ناگپور کے نام نکلا اور ۱۹۴۸ء میں آپ نے ناگپور کو اپنا مستقر بنالیا۔ اور اگر چہ یہ آزادی کا قریب ترین زمانہ تھا اور حساسیت کے اعتبار سے مولانا کا وہاں قیام فرمانا دنیوی مصلحتوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ سودمند نہ تھا مگر مولانا نے دنیوی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہاں اپنی تعلیمی اور دعوتی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کر دیا اور حدی را تیز تر می زن چوں محمل را گراں بینی کے مصداق امامت، تدریس اور تصنیف کے سہ گونہ فرائض کو بھی اپنی مصروفیات زندگی میں شامل کرلیا، غالبًا یہ مدرسہ مسجد ہی سے متعلق تھا اس لیے آپ کو مسجد کا ایک حجرہ مل گیا تھا اور یہیں آپ نے اپنی پہلی باقاعدہ تصنیف ''اسلام کا زرعی نظام'' کی تکمیل کی۔ لیکن بہر حال یہ مرحلہ سفر بھی آخر کار تمام ہوا اور آپ کی تدریسی زندگی کی اگلی منزل دارالعلوم معینیہ اجمیر ثابت ہوئی۔ وہاں نہ صرف آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں بلکہ اس مدرسہ کے صدرالمدرسین بھی رہے یہاں آپ نے علمی کاموں کے ساتھ ساتھ سماجی او سیاسی کام بھی شروع کئے اور اپنا ایک چھوٹا سا ادارہ علم وعرفان کے نام سے قایم کیا نیز انھوں نے منظور حسین صاحب ایڈوکیٹ اور محمد یوسف صاحب سابق ایڈیٹر ریڈینس وغیر کے ساتھ مل کر دینی تعلیمی کونسل کو بھی فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا، اجمیر میں آپ کا مدت قیام غالبًا دس گیارہ سال پر محیط ہے اس کے بعد آپ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی گزارش پر چند مہینوں کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ سے بھی وابستہ رہے اور اس کے بعد آپ علی گڑھ تشریف لے آئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آپ کی تصنیفی اور تدریسی زندگی کا آخری پڑاؤ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صاحب مولانا مرحوم کے علی گڑھ

میں قیام کے تعلق سے اپنے ایک تعزیتی مضموں میں رقمطراز ہیں۔

''۱۹۶۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچررو ناظم سنی دینیات کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور بہت جلد طلباء اساتذہ اور ملازمین کی محبتوں کا مرجع بن گئے ۱۹۸۴ء میں محنت و دیانت کے ساتھ انجام دی گئی ان کی بیس سالہ خدمات اور علمی حلقوں میں ان کی مقبولیت اور مرجعیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے ان کو پروفیسر شپ کی پیش کش کی جسے مولانا نے قبول کرلیا اور اگست ۱۹۸۷ء تک مولانا تدریسی خدمات کے ساتھ صدر شعبہ دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کی حیثیت سے تعلیمی اور انتظامی فرائض انجام دیے۔ مولانا کی طویل دینی و علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سابق شیخ الجامعہ سید ہاشم علی صاحب نے ۱۹۸۹ء تک ان کی ملازمت میں توسیع کردی''[۴]

۱۹۸۹ء میں مولانا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات میں اپنی تدریسی زندگی سے ریٹائر ہو گئے مگر اس عظیم شخص کی عظیم داستان ریٹائرمنٹ پر آکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ انھوں نے اپنی علمی و دینی اور سماجی خدمات کے لیے کچھ مزید جولان گاہوں کا بھی انتخاب کیا جن کا تذکرہ ہم آگے کررہے ہیں۔

مولانا کی دیگر دینی، ملی اور علمی خدمات:

مولانا محمد تقی امینی صاحب اگر چہ بنیادی طور پر ایک مدرس تھے اور انھوں نے اپنی پوری زندگی علم دین کو پڑھنے اور پڑھانے میں گذار دی مگر دین کے اس سپاہی نے اپنے علم و دانش اور تفکر و تدبر کے لیے کئی اور جولان گاہوں کا بھی انتخاب کیا تھا جس نے ان کی صلاحیتوں کو مہمیز کیا۔ اور خدمت دین کے کئی محاذوں پر ان کا جوہر نکھر کر سامنے آیا ہم ان میں سے بعض کا تذکرہ یہاں کرتے ہیں:

۱- مناظرہ:

مولانا امینی نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور علمی شعور و پختگی حاصل کی اس دور میں دین

کی خدمت کے لیے مباحثہ ومناظرہ کی روایت قائم تھی اور اس میدان میں مولانا منظور نعمانی صاحب اور مولانا ثناءاللہ امرتسری جیسے بزرگ ڈٹے ہوئے تھے انہیں سے متاثر ہوکر مولانا نے یہ محاذ سنبھالا۔ دراصل اجمیر میں قیام کے دوران ہی آپ کا یہ احساس شدید ہوگیا تھا کہ شرک و بدعت عوام الناس پر پوری طرح مسلط ہوچکی ہے اور نام نہاد علماء نے یہ بدعات وخرافات کو عام کرکے اپنا ایک وسیع حلقہ بنالیا ہے اور اس حلقہ کے ولی وکارساز بن بیٹھے ہیں اور کے اردگرد پیری مریدی اور بدعات وخرافات کا جال ایسا بن رکھا ہے جس سے عوام کالانعام کو نکالنا آسان نہیں تو مولانا نے بھی کمر کس لی اور قرآن وسنت کے حوالوں سے ان کو جواب دینے لگے اور غالباً اجمیر چھوڑنے کی بنیاد ی وجہ بھی یہی تھی کہ یہاں کے جاہل صوفیوں اور نام نہاد علماء جن کا وہاں بڑا دبدبہ تھا انھوں نے ان کے خلاف سازشیں کیں اور انہیں وہاں سے نکلوا کر ہی رہے۔ مولانا کے مناظرے عام طور پر شیعہ اور بریلوی حضرات سے ہوتے تھے اور اجمیر سے آکر مدرسہ فرقانیہ کے قیام کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ وہ اس طرح کے بدعتی علماء سے مناظرہ کریں اور وہاں انہیں قدم نہ جمانے دیں چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ نے بارہ بنکی، لکھنؤ اور کانپور نیز مضافات میں متعدد مناظرے کئے اور جہاد باللسان کا حق ادا کردیا اس راہ جہاں میں انھوں نے اپنوں اور غیروں کے طنز وملازمت کے، تیر بھی سہے وہیں اور کچھ لوگوں نے ہمنوائی بھی کی۔ مولانا مرحوم کے ایک ہمنوا اور قدرداں انہیں کے علاقے کے ایک بزرگ جناب شفیع صاحب بھی تھے جن کا مولانا اکثر تذکرہ فرماتے تھے مولانا مرحوم اکثر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے ایک جملے کا تذکرہ بھی کرتے تھے، جس کا قصہ یہ ہے کہ جب مولانا مخالفین اور نام نہاد علماء سوء کے طنز وملامت اور ان کی افتر پردازیوں سے سخت بددل ہوگئے تو ان حالات کی تفصیل مولانا مرحوم نے مفتی صاحب کو لکھ بھیجی اس پر مفتی صاحب کا جواب آیا جس کا ایک جملہ یہ تھا۔

''یہ ضروری ہے کہ آدمی جب بھی کہے حق بات کہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر وقت کہتا رہے''۵

مگر مناظرہ بازی کا یہ سلسلہ بہت دنوں تک نہ چل سکا اور بہت جلد خود مولانا کی طبیعت حق شناس اس مخصوص طریق دعوت سے اُکتا گئی اور انھوں نے اس میدان کو خیر باد کہا:

۲- مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام:

دراصل ۱۹۶۳ء میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں مسلم زعماء کی ایک میٹنگ ہوئی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اگرچہ حکومت عجلت میں تو شاید مسلم پرسنل لو میں کوئی مداخلت نہ کرے مگر آئندہ کے لیے کوئی گارنٹی بھی نہیں اس پر مولانا نے ایک خط کے ذریعہ علماء امت کو اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس دلایا اور تدوین فقہ جدید کی اہمیت اور ضرورت کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس مراسلہ کو نہ صرف اپنے اخبار صدق جدید میں شائع کیا بلکہ مولانا کی رائے کی تحسین بھی کی اور اس کا طریقہ کار بھی بتایا چنانچہ اس پس منظر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا مرحوم کو نہ صرف لکھنؤ آنے کی دعوت دی بلکہ اس مشن کو آگے بڑھانے کے لیے باصرار آپ کو بلایا، مولانا ندویؒ اپنے خط میں لکھتے ہیں۔ میں مخلصانہ طریقہ پر آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قدیم وسیع اور معروف ادارہ سے آپ کی وابستگی اور تعلق اور اس کے وسائل کا حصول آپ جیسے صاحب صلاحیت عالم کے لیے بہت مفید اور اس کے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے معاون ہوگا۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی ایسا بڑا کام لے جو نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے مفید اور وقت کا ایک اہم کام ہو''[۱]

لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور مجلس نے اپنی پہلی ہی میٹنگ میں مسلم پرسنل اللہ کے مسئلہ کو لینا مناسب نہیں سمجھا اور کچھ جدید مسائل پر کام کرنے کی بات شروع کر دی، مولانا کو اس صورت حال سے سخت بددلی پیدا ہوگئی اور چند مہینوں کے اندر ہی آپ نے مجلس تحقیقات شرعیہ چھوڑ دیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لے آئے۔

۳- مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی نظامت:

شعبہ دینیات کی نظامت اگرچہ آپ کی تدریسی زندگی کا ایک جزو تھی مگر اس کا تذکرہ الگ سے اس لیے ضروری ہے کہ کیوں کہ یہاں عوام سے اور یونیورسٹی کے طلباء واساتذہ سے روابط کا پورا منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس اہم منصب کے حق کو ادا کرنے میں کسی بڑے سے بڑے عہدہ دار کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اور حق بات علیٰ الاعلان اور ڈنکے کی چوٹ پر کہی، اس کی کچھ تفصیلات اس طرح ہیں۔

علی گڑھ میں ۱۹۷۴ء میں مولانا کی آمد شعبہ دینیات کے ناظم اور لکچرر کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ یونیورسٹی کا یہ شعبہ ایک عظیم اہلیت اور ذمہ داری کا متقاضی ہے اس کے تحت یونیورسٹی کے تمام دینی امور ومعاملات آتے ہیں ناظم دینیات یونیورسٹی کے جملہ شعبہ جات کے دینی امور کا سربراہ ہوتا ہے خواہ یونیورسٹی کی مساجد کے لیے ائمہ اور موذنین کے مسائل ہوں یا دینی جلسے جیسے عید میلا دالنبی اور اس سے متعلق مشاعرہ یا دیگر شعبہ جات کے طلباء کے تربیتی مسائل وغیرہ غرض یونیورسٹی سے متعلق ہر طرح کے دینی امور کی سرپرستی اور ذمہ داری کے مسائل کا وہ براہ راست نگراں ہوتا ہے۔ ایسے شعبہ کی نظامت آپ نے ایک طویل عرصہ تک فرمائی اور نہ صرف کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا بلکہ حق بات علیٰ اعلان اور ڈنکے کی چوٹ پر کہی۔ اس کی چند مثالیں حاضر خدمت ہیں۔

مولانا سعود عالم قاسمی صاحب اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں۔

''مولانا ممدوح علی گڑھ میں ناظم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد پابندی سے ہر جمعہ کو جامع مسجد میں ۲۰ منٹ کا اردو میں جامع اور بلیغ خطبہ دیا کرتے تھے اس خطبہ میں شریک ہونے کے لیے بہت سے نمازی پہلے سے جگہ لیتے اور ذوق وشوق کے ساتھ ان کا خطبہ سنتے ممتاز ادیب وعلیگ پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم بھی انہیں میں سے ایک تھے بلکہ یہ بزرگ پابندی سے اپنے تاثرات کا اظہار بھی فرماتے مولانا اپنے خطبہ میں مبادیات دین سے لے کر تاریخی وعلمی مسائل اور حالات

حاضرہ کے بہت سے حقائق و معارف کو سمیٹ لیتے تھے مولانا کا اپنا انداز بیان ہوتا اپنا رنگ و آہنگ ہوتا جسے جمیل بھی کہئے اور جلیل بھی مولانا کے خطبات مدتوں یاد کئے جائیں گے ان خطبات میں یونیورسٹی کا کوئی ملازم نہیں بلکہ ایک عالم دین اپنی حق گوئی و بیبا کی کی روایتی شان کے ساتھ نظر آتا تھا''۔ ے

جمعہ کے خطبات کے علاوہ مولانا مرحوم کے ذمہ عیدین کے خطبے بھی تھے ان خطبات کی قیمت اور وقعت کے پیش نظر مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۳ء میں انہیں کتابی شکل میں شائع کیا تھا ان خطبات کے مطالعہ سے مولانا کی دینی امور میں بصیرت استنباط مسائل اور دقیق نکتہ سنجیوں اور مولانا کی ذہنی وسعت و ہمہ گیریت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مولانا مرحوم حق بات کہنے میں کسی رشتہ اور تعلق اور کسی کے منصب وحیثیت کا بالکل لحاظ نہیں کرتے تھے جو بات ان کو صحیح اور حق معلوم ہوتی اسے کمال جرأت کے ساتھ ظاہر فرماتے تھے اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے مسلم یونیورسٹی کے کینڈی ہال میں مولانا علی میاں ندویؒ صاحب کی ایک تقریر ان کی برپا کردہ تنظیم ''پیام انسانیت'' کے تعلق سے ہوئی اس میں مولانا ندویؒ نے فرمایا کہ ہمیں اس قسم کا کام ہر قسم کی لالچ اور مفاد سے بلند ہوکر کرنا چاہیے دوران تقریر ان کی زبان سے یہ جملہ بھی نکلا کہ ہمیں دینی مفاد سے بھی بلند ہوکر یہ خدمت کرنی چاہیے۔ مولانا ندویؒ کا ارادہ خواہ اس جملہ سے کچھ بھی رہا ہو مگر مولانا امینی مرحوم کو ان کی یہ بات غلط محسوس ہوئی اور انھوں نے اپنے جمعہ کے خطبہ میں کھل کر اظہار فرمایا اور دلائل کے ذریعہ ثابت فرمایا کہ دین کی سربلندی کا جذبہ ہر لحاظ سے مقدم ہونا چاہیے کسی اور جذبہ اور رجحان کی اولویت کس طور بھی صحیح نہیں ہے۔

اس طرح ایک بار یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں جسے عبداللہ گرلس کالج کہا جاتا ہے ایک مخلوط ثقافتی پروگرام منعقد ہوا جس میں غالباً طالبات نے رقص وغیرہ بھی کیا، اس کی شکایت بعض طلباء نے مولانا سے دینی امور کے ذمہ دار کی حیثیت سے کی، مولانا نے اس واقعہ کا سخت نوٹس لیا اور

اپنے جمعہ کے خطبہ میں اس پر نکیر فرمایا اور منتظمین کے خلاف سخت تقریر کی جو مختلف اخبارات وجرائد میں چھپی اور شیخ الجامعہ سید حامد صاحب کے لیے اس کی جوابدہی مشکل ہوگئی۔

اس طرح ایک بار وائس چانسلر نے آپ کو پیغام بھجوایا کہ عالم عرب سے ایک اہم شخصیت آئی ہے لہٰذا اُن کے لیے اگلی صف میں جگہ خالی رکھی جائے اور ان کے لیے خاص طور پر قالین بچھائی جائے مگر مولانا نے وائس چانسلر کی بات ٹال دی اور یہ کہلا بھیجا کہ کی مسجد اللہ کا گھر ہے اور اس جگہ امیر وغریب میں کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی۔

بہرحال مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بہت تابناک ہے کہ وہ حق پر قائم رہنے کے معاملہ میں بہت سخت تھے اور اپنی ملازمت بچانے کے لیے کسی اعلیٰ عہدیدار کی تملق اور چاپلوسی کبھی نہیں کرتے تھے اور یہی دراصل ایک صحیح اور برحق عالم کا شیوہ بھی ہونا چاہیے۔

۴- احتساب کا اجراء:

مولانا کی زندگی کے اہم کارناموں میں سے احتساب اخبار کا اجراء بھی ہے یہ اخبار پندرہ روزہ تھا اور عام معنوں میں کوئی اخبار بھی نہیں تھا بلکہ اس میں مولانا کے اہم علمی اور دینی مضامین اور قومی وسماجی مسائل پر مشتمل مولانا کی آراء وخیالات شائع ہوتے تھے اس میں مولانا مختلف استفسارات ومسائل کے جواب بھی دیتے تھے جو ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کی جانب سے پوچھے جاتے تھے اور مختلف موضوعات پر مولانا کے اہم اور وقیع خیالات لوگوں کے سامنے آتے تھے اور ان کی رہنمائی ہوتی تھی۔ اسی اخبار میں جماعت اسلامی ہند کی جانب سے پوچھے گئے ایک اہم علمی سوال کا جواب بھی ہے جو جماعت اسلامی میں مسلسل متنازعہ فیہ رہا ہے اور وہ تھا سیکولر حکومت میں دینی جماعتوں کا الیکشن میں حصہ لینے کی بابت مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مسلمانوں کو قومی زندگی سے علیحدہ اور الگ تھلک رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے۔

ان ستفسارات کو ان کی اہمیت کے پیش نظر غالباً ۱۹۸۳ء میں پہلی بار کتابی شکل میں

مراسلات کے نام سے شائع کیا گیا ہے جسے عام طور پر بہت پسند کیا گیا کیوں کہ مولانا کا طرز استدلال عقل و درایت کے معیار پر نہ صرف پورا اترتا تھا بلکہ اس کے ہر جزئیہ کے لیے مولانا قرآن وحدیث اور سلف صالحین کے حوالے بھی دیتے تھے جس سے ان کی رائے وقیع اور مستند ہو جاتی تھی۔

لیکن یہ اخبار مولانا کی بیماری کی وجہ سے بہت دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور اس کے باوجود بند کردینا پڑا۔ اسے بند کرنے سے متعلق ایک واقعہ بھی سنتے چلئے جب مولانا نے اسے بند کرنے کا ارادہ کیا تو خریداروں کی بقیہ اعانت کی رقم کی واپسی کا انتظام فرمایا فیض آباد کے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ میں احتساب کا خریدار تھا، ایک مرتبہ احتساب نہیں آیا پھر کچھ دنوں کے بعد منی آڈر سے باقی پیسہ واپس آگیا اور رسید میں یہ وضاحت کی گئی کہ احتساب بند ہو گیا ہے اور آپ کی بقیہ امانت واپس کی جاتی ہے۔

بہر حال اس اخبار نے بعض اہم دینی وملی مسائل پر رہنمائی کا اہم فریضہ انجام دیا مولانا مرحوم اس کے لیے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے نہایت امانت داری سے اپنے اوپر عاید اس ملی فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کی اور اس کی بخوبی ادائیگی کی۔

مولانا کی دیگر سرگرمیاں:

مولانا مرحوم ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے سرگرمیوں اور ولولوں سے بھر پور زندگی گذاری، وہ صرف ایک مولوی ہی نہیں تھے بلکہ ملک وملت کے تئیں ایک نرم اور حساس دل بھی رکھتے تھے وہ جناب منظور حسین صاحب ایڈوکیٹ اور محمد یوسف صاحب سابق ایڈیٹر ریڈینس کے ساتھ مل کر دینی تعلیمی کونسل کے روح رواں رہے، اپنا چھوٹا سا ادارۂ علم وعرفان بھی قائم کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے کنوینر کی حیثیت سے بھی کچھ دنوں تک کام کیا ، یونیورسٹی کی جامع مسجد میں بھی ایک طویل مدت تک خطبات جمعہ وعیدین کی ذمہ داریاں سنبھالیں اس طرح مولانا دینی جلسوں علمی سمیناروں مشاورتی میٹنگوں اور مسلم پرسنل لا کے اجلاسوں میں بھی

شرکت فرماتے رہتے تھے اور اس طرح سے انہوں نے اپنی دینی، علمی اور امتیازی حیثیت کی مثبت چھاپ ذہنوں پر چھوڑی لوگ آپ کی عالمانہ اور مدلل گفتگو سے نہ صرف متاثر ہوتے بلکہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو تسلیم کرتے ہوئے آپ سے بھرپور استفادہ بھی کرتے ان سرگرمیوں کے پہلو بہ پہلو آپ نے مختلف اہم موضوعات پر لگ بھگ ڈیڑھ درجن کتابیں بھی تصنیف کیں جن کا تفصیلی تذکرہ ہم الگ ایک باب میں کریں گے اور ان کا تفصیلی تعارف بھی پیش کریں گے۔ ان باقاعدہ کتابوں کے علاوہ مولانا نے مختلف اہم علمی اور دینی موضوعات پر مقالات ومضامین بھی لکھے جنہوں نے ہندو بیرون ہند کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے اہل علم سے خراج تحسین وصول کیا۔ ان رسائل میں حکمت القرآن پاکستان، برہان دہلی، الفرقان لکھنؤ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ معارف اعظم گڑھ، خاص طور سے قابل ذکر ہیں ان کے علاوہ یونیورسٹی کے اہم رسائل، تہذیب الاخلاق، فکرونظر اور دراسات دینیہ وغیرہ میں بھی آپ کے مضامین مستقل شائع ہوتے رہے تھے۔

مولانا کی عائلی زندگی:

مولانا کی فیملی ایک عام اور متوسط طرز کی فیملی تھی، اہلیہ محترمہ جو الحمدللہ آج بھی بقید حیات ہیں مستقل بیمار رہتی تھیں لیکن مولانا ان کی طرف سے کبھی غافل نہ رہے ہمیشہ ان کی خبر گیری کرتے رہے اہلیہ کی مستقل بیماری کی وجہ سے مولانا کو عقد ثانی کے مشورہ بھی دئے گئے مگر آپ نے انہیں قبول نہیں فرمایا یہاں تک کہ ۱۹۸۰ء میں آپ خود نقرس اور داڑھ کے شدید درد میں مبتلا ہو گئے مگر اس حالت میں بھی اہلیہ کی نگہداشت اور ان کی تیمارداری سے غافل نہ رہے۔

مولانا کے کل چھ اولادیں تھیں دو لڑکے اور چار لڑکیاں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) ہلال ظفر امینی (۲) مسعود الظفر امینی (۳) سعدیہ امینی (۴) رشیدہ امینی (۵) عارفہ امینی (۶) شاہدہ امینی۔ اہلیہ محترمہ کا نام آصفہ بیگم ہے۔ الحمدللہ ابھی بقید حیات ہیں لیکن صحت کا برابر حال

وہی ہے کہ جوتھا اللہ تعالیٰ انہیں صحت عاجلہ ومستمرہ سے نوازے۔

الحمدللہ لڑکے برسرِ روزگار ہیں اور بچیاں بھی اکثر اپنے اپنے گھروں کو جاچکی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس خانوادے کو شرافت، نجابت اور خودداری کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد سے ہی مولانا کی صحت دن بدن گرتی جارہی تھی نقرس کا مرض کافی پریشانی کئے ہوئے تھا سمیناروں جلسوں اور میٹنگوں وغیرہ میں آنا جانا موقوف ہوگیا تھا مضموں نویسی جس کے لیے آپ ہمیشہ تیار رہتے تھے وہ سلسلہ بھی یک قلم بند ہوگیا تھا مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم فرماتے ہیں کہ میں نے معارف کے لیے مولانا سے مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ اب اسے بھول جاؤ اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا تھا وہ لے چکا بالآخر ۲۱/جنوری ۱۹۹۱ء کو وہ ساعت آ ہی گئی جس کا آنا ہر ذی نفس کے لیے مقدر ہے مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا مولانا کو ان کی وصیت کے مطابق یونیورسٹی کے قبرستان میں مولانا فضل اللہ جیلانی کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا اور اس طرح لگ بھگ ۷۴ سال کی عمر میں ایک بھرپور تدریسی تصنیفی اور سماجی زندگی گذار کر مولانا خالق حقیقی سے جاملے۔ آپ کے جانے سے جس طرح ایک بڑا علمی حلقہ سوگوار ہوا اسے دیکھ کر بے ساختہ اس حماسی شاعر کا شعر زبان پر آگیا جس نے کہا تھا۔

فما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تهدما

انا لله وانا اليه راجعون الهم اغفرله وارض عنه وبزد مضجعه آمين

مولانا اپنی ذاتی سیرت وکردار کی روشنی میں:

مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ مولانا مرحوم کی ذاتی سیرت وکردار کے حوالہ سے یوں رقمطراز ہیں۔

''فراخدلی وسیع المشربی، مروت، شرافت سادگی، اخلاق دردمندی ان کی سیرت واخلاق کا نمایاں جوہر تھا وہ بڑے مرنجان مرنج شخص تھے، سب سے محبت گرم جوشی اور بے تکلفی کی وجہ سے سن

وسال اور علم ومرتبہ میں کمتر لوگ بھی ان سے شوخ اور گستاخ ہو جاتے تھے وہ چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے، ان کی دلی جوئی اور حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہ لیتے، اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ہوتا تو اس کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کرتے بات کرنے میں لاگ لپیٹ سے بالکل کام نہ لینے ہمیشہ صاف اور کھری باتیں کرتے تھے۔ ان میں بڑی جرأت اور خود اعتمادی تھی بات کہتے۔ میں کسی کی رورعایت بالکل نہ کرتے تھے اسی وجہ سے بعض لوگ ناراض بھی ہو جاتے تھے مگر وہ اس کی پرواہ بالکل نہ کرتے تھے[۸]

مولانا نے نہایت نرم وگداز دل اور بڑی حساس طبیعت پائی تھی ایک بار دارالعلوم دیوبند سے کچھ طالب علم مولانا سعود عالم قاسمی صاحب کے ساتھ مولانا سے ملنے ان کے پاس تشریف لے گئے، سردیوں کے دن تھے اور ان میں سے ایک طالب عالم نے سوئٹر قمیض کے نیچے پہن رکھا تھا، مولانا سمجھے غالباً اس طالب علم کے پاس سوئٹر نہیں ہے چنانچہ مولانا نے قاسمی صاحب کو الگ بلا کر کچھ پیسے دیئے کہ مذکورہ طالب علم کو سوئٹر دلا دیں جب قاسمی صاحب نے اصل صورت حال بتائی کہ اس طالب علم نے سوئٹر قمیض کے اندر پہن رکھی ہے تو بھی مولانا نے پیسے واپس نہیں لیے اور فرمایا کہ یہ پیسے اسے پھر بھی دے دیں سفر وغیرہ میں کام آئیں گے۔

مولانا نے بڑی معصوم طبیعت پائی تھی جلد ناراض بھی ہو جاتے اور جلد ہی مان بھی جاتے کسی کو ڈانٹ دیتے پھر اگر اپنی غلطی محسوس کرتے تو معافی بھی مانگ لیتے، ایک بار فیکلٹی کے ایک چپراسی کو کسی بات پر ڈانٹ دیا مگر پھر آپ نے کچھ محسوس کیا تو دوسرے ہی دن اس سے معافی بھی مانگ لی اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے کہ لو چائے پی لینا یہ دل موہ لینے والی ادا کسی کو کہاں ملتی ہے!

مولانا خرچ واخراجات کے معاملہ میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے اخراجات کے معاملہ میں بڑے کشادہ دست تھے، متعدد طلباء کے واجبات وہ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے،

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب مولانا سے کہنے لگے کہ مولانا ایک عورت برقعہ پہن کر آتی ہے آپ سے پیسے مانگتی ہے آپ دے دیتے ہیں پھر وہی عورت برقعہ اتار کر آتی ہے اور آپ سے سوال کرتی ہے تو بھی آپ اسے منع نہیں کرتے ہیں مولانا نے لوگوں کی ضروریات کا حوالے دے کر انہیں خاموش کر دیا اور اس اصول پر مرتے دم تک عمل کرتے رہے کہ سخی کی کمائی میں سب کا حصہ ہے۔

مولانا سعود عالم قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا طالب علموں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے، ان کے مسائل پوچھتے اور ان کی ضرورت کا خیال رکھتے، بہت سے طلباء کی مالی امداد کرتے کسی کو تکلیف میں مبتلا دیکھتے تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس کی مدد کے لیے بے چین رہتے غریبوں اور ناداروں کا پورا خیال رکھتے، کبھی اپنے دروازے سے سائل کو ناکام نہ لوٹاتے تھے، ایسے لوگوں کا پتہ چلاتے جو ان کی مدد کے مستحق ہوتے۔ اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے [9]

مولانا اپنے شاگردوں اور کم عمر نوجوانوں کے جذبات کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے ہوگا۔

ایک بار مولانا عید قرباں کے موقع پر نئی شیروانی زیب تن کئے ہوئے تھے محلّہ کے لڑکوں نے حسب روایت مٹھائی کا مطالبہ کیا مولانا نے بھی چھیڑا کہ بھئی ایک ہی شیروانی کے پیسے درزی بھی لے اور تم لوگ بھی پھر جیب سے دس کا نوٹ نکال کر دیا، لڑکوں نے کہا مولانا یہ تو کم ہیں مولانا نے دس کا ایک اور نوٹ عنایت فرمایا اس طرح دل لگی کی دل لگی رہی اور بچے بھی خوش ہو گئے۔

عام طور پر کسی بڑی شخصیت کو دوسری شخصیت کا اعتراف کرتے ہوئے کم ہی دیکھا گیا ہے مگر مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ دوسری شخصیتوں کا نہ صرف اعتراف کرتے تھے بلکہ ان کے اکرام میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے اور جس کی جو بات بھی اچھی لگتی اسے اپنانے میں کوئی عار

محسوس نہ کرتے ،ایک مرتبہ مشہور ہندی مترجم قرآن مولانا محمد فاروق خان صاحب ان سے ملنے آئے مولانا نے ان سے دریافت فرمایا بتایئے اللہ کے یہاں نجات مشکل ہے یا آسان خان صاحب نے کہا آسان بھی اور مشکل بھی اور وہ یوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ راست بازی اختیار کی جائے تو نجات نہایت آسان ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالاکی اختیار کی جائے تو نہایت مشکل اس لیے عافیت اسی میں ہے کہ اگر انسان سے گناہ کا صدور ہو جائے تو سچے دل کے ساتھ اعتراف گناہ کرے اور ٹال مٹول اور دغا فریب کی پالیسی اختیار کرنے سے گریز کرے ،مولانا کو فاروق خاں صاحب کا یہ جملہ اس قدر پسند آیا کہ وہ اسے اپنی مجلسوں تقریروں اور گفتگوؤں میں اکثر دہراتے ، یہ ایک بڑے عالم کی طرف سے دوسرے عالم کا ایسا اعتراف تھا جو فی زمانہ کم یاب بلکہ نایاب ہے۔

اسی طرح ایک بار مولانا سعود عالم قاسمی صاحب اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر تھے اور گفتگو مصر کے ظالم ڈکٹیٹر جمال عبدالناصر پر چھڑ گئی جس نے اسلامی جماعت الاخوان المسلمون پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیئے تھے۔مولانا کو شاید مصر کی صحیح صورت حال معلوم نہ تھی یا وہ اخوان کو محض ایک سیاسی جماعت سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے فرمایا کہ اخوان نے جمال عبدالناصر سے اس کی حکومت چھیننی چاہی تو وہ بھی انہیں ختم کرنے اور مٹانے کے درپے ہو گیا، اس طرح معاملہ برابر کا ہی تھا اس پر قاسمی صاحب نے فرمایا کہ مولانا اسی طرح کی بات تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے فرعون کی حکومت چھیننی چاہی تو اس نے بھی ان پر مظالم کئے یہ معاملہ بھی تب برابر کا ہی رہا، مولانا یہ سنکر بہت ناراض ہوئے اور ان کے ساتھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان کی دیدہ دلیری دیکھتے ہیں۔انھوں نے نبی اور غیر نبی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا پھر یہ بات وہیں ختم ہو گئی مگر مولانا کے دماغ کو جیسے شاک سا لگ گیا ہو اور غالبًا انھوں نے رات میں اس پر سوچا ہو گا اس لیے صبح سویرے نماز فجر کے فوراً بعد قاسمی صاحب

کے کمرے پر گئے اور فرمانے لگے بھئی رات میری بات سے شاید تمہیں تکلیف پہونچی ہو مجھے معاف کردینا، قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''ایسے دور میں جب اپنی باتوں پر اصرار اور ہر بات میں اپنی انا کا اظہار دانشوری کا معیار بننے لگا ہو، مولانا کا کردار بڑا پاکیزہ نظر آتا ہے۔

مولانا کو دوسروں کی تکلیفوں کا کس قدر احساس رہتا تھا اور وہ ان کی مدد اور تعاون کے لیے کس قدر خلوص سے آمادہ ہو جاتے تھے اس کے بارے میں مولانا ضیا الدین اصلاحی مرحوم فرماتے ہیں کہ ایک بار جب مولانا میرے ساتھ دارالمصنفین میں قیام پذیر تھے تو رات میں دس بجے ایک صاحب بطور مہمان تشریف لائے۔ ہم لوگ ان سے واقف نہ تھے میں ان کے سونے کا انتظام کرنے میں لگ گیا۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ وہ بھوکے بھی ہیں مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ پہلے ان کے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے۔ اگر یہاں ممکن نہ ہو تو چلو ہم دونوں بازار سے کھانا لے آئیں میں نے عرض کیا۔ مولانا اب تو بازار بھی بند ہو گئے ہوں گے اس وقت کہاں سے کھانا مل سکے گا اس وقت تو صرف چائے بسکٹ کا ہی انتظام ہو سکتا ہے مہمان موصوف کو اس پر قناعت کرنی چاہیے مگر بھلا مولانا کہاں ماننے والے تھے فرمایا سوچو اگر اس جگہ ہم یا تم ہوتے تو ہمارا کیا حال ہوتا اس پر میں لاجواب ہو گیا تھوڑی دیر بعد خیال آیا کہ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا گھر قریب ہی میں ہے وہاں سے شاید کچھ انتظام ہو سکے چنانچہ میں اور مولانا دونوں ان کے یہاں پہنچے کھانے کا انتظام ہو گیا اور مہمان موصوف نے جب کھا پی لیا تب مولانا کی پریشانی اور بے چینی دور ہوئی۔

دل بدست آور کی حج اکبر است کا صحیح مصداق اگر دیکھنا ہو تو مولانا کو دیکھئے۔ مولانا اصلاحی بیان فرماتے ہیں کہ ایک بار میں قصبہ صبر حد ضلع جون پور کے مدرسہ فارقیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی غرض سے گیا یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا شدید بیمار تھے اور اسی سبب سے کہیں آنا جانا یکسر موقوف

ہوگیا تھا۔ جب میں وہاں پہونچا تو معلوم ہوا کہ مولانا تشریف لانے والے ہیں اور ڈاکٹر محمد صاحب نائب مدیر ''فکرونظر'' کی رہائش گاہ پر ہم دونوں کے قیام کا انتظام ایک ساتھ ہے میں نے ملاقات پر مولانا سے ہنس کر عرض کیا اب معلوم ہوا کہ علالت کا عذر تو محض بہانہ ہے۔ آپ یہاں تک چلے آئے اور علالت کا عذر مانع نہ ہوا۔ فرمایا کہ ڈاکٹر صابر صاحب کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی آخر بیچارے مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں ان کی دل شکنی میں کیسے کرتا۔

دوسروں کی مدد مولانا جی جان سے کرتے وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے مولانا اصلاحی فرماتے ہیں ایک بار میں یونیورسٹی میں ایک صاحب کے داخلہ کے سلسلہ میں کافی پریشان رہا لیکن مولانا مرحوم اور سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے میری مدد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

وہ اس معاملہ میں مسلک وغیرہ کا بھی خیال نہ فرماتے تھے، ایک بار (طبیہ) کالج کے پرنسپل صاحب سے کسی ضرورت مند کی سفارش کی تو انھوں نے کہا حضرت وہ تو بریلوی مسلک کا آدمی ہے اور آپ اس کی سفارش کررہے ہیں مولانا نے فرمایا کچھ بھی ہو وہ مسلمان تو ہے اس کی مدد ہونی چاہیے۔

مذہبی جماعتوں کے سلسلہ میں مولانا کا نقطہ نظر حکیمانہ اور معتدلانہ تھا وہ نقطہ نظر کی سختی اور مفاد پرستی دونوں سے الگ رہتے اور جس چیز کو حق سمجھتے اس کا کھل کر ساتھ دیتے، مولانا مسلک و جماعت کی تفریق کے بالکل قائل نہیں تھے وہ ہر شخص کے اچھے، پہلوؤں اور کارناموں کا اعتراف کرتے اکثر یہ جملہ فرماتے، ''ساری مذہبی جماعتیں ٹھیک ہیں کسی نے حق پر ہونے کا اللہ تعالیٰ سے پٹہ نہیں لکھوا کرلیا ہے''۔ ان کا شیوہ اقبال کی زبان میں یہ تھا۔

تمیز رنگ وبو مارا حرام ست
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

مولانا کی طبیعت میں نرمی اور شرافت بھی بہت تھی وہ دوسروں کی ضرورتوں کو بہت دور تک دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ سلیکشن کمیٹی میں بیٹھتے تو امیدوار سے بہت کم سوال کرتے،

فرماتے مجھے امیدواروں سے بڑی ہمدردی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ اس صلاحیت کے ساتھ میں اس کرسی پر ہوں اور وہ اس جگہ ہم دونوں کے درمیان بھلا کتنا فرق ہے یہ تو حالات ہیں جن کی وجہ سے وہ بے چارہ ہمیں انٹریو دے رہا ہے۔

بندوں کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی بڑے مخلص تھے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کا برملا اعتراف کرتے، ایک بار فرمایا تئیس سال تک جامع مسجد کے منبر پر تقریریں کیں لوگوں کو نیک و بد اوراچھائی برائی سمجھاتا رہا مگر میں عمل کے معاملہ میں خود ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکا عبادتیں تو کسی نہ کسی طور پر جاری وساری ہیں مگر معاملات میں داخل نہ ہوسکا۔

یہ ہے اس نیک دل اور پاکباز آدمی کا اعتراف گناہ اور اگر یہ بات سچ ہے کہ اعتراف گناہ سے انسانی کی صفائی قلب کا اظہار ہوتا ہے تو وہ سچ مچ ایک صاف دل اور پاکباز انسان تھے۔

تفمد ہ اللہ برحمتہ وادخلہ فسیح جنتہ۔

مولانا مرحوم جیسا کہ معلوم ہے مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے۔ اس مدرسہ کی مختصر تاریخ روداد مولانا کی زندگی میں ہی شائع ہوئی تھی اس میں اس رسالہ کے مرتب نے امینی صاحب کے بارے میں اس طرح نوٹ لگایا ہے۔

مولانا کے بارے میں اصحاب فکروعمل کی رائے:

مولانا مرحوم کے علم وفضل اور کمال فکر کا اعتراف بہت سے اہل علم وفضل نے کیا ہے، یہ دراصل ان کو ایک عظیم خراج تحسین ہے کیوں کہ خلق خدا کا غائبانہ اعتراف ہی دراصل کسی شخصیت کی حقیقی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ ہم یہاں چند بلند پایہ اصحاب فکروعمل کی چند رائیں یہاں درج کررہے ہیں۔

مولانا نہایت ذکی ذہین اور قابل ترین عالم ہیں آپ اجمیر میں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ پھر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک معزز عہدے پر فائز ہوئے ''اسلام کا زرعی نظام'' وغیرہ کئی

کتابوں کے مصنف ہیں، ابھی اس وقت آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک بڑے عہدہ پر فائز ہیں۔[۱۱]

عالم عرب کے مشہور اسلامی مفکر اور ادیب ڈاکٹر عبدالحلیم عویس جنھوں نے مولانا کی بعض کتابوں کو عربی میں ایڈٹ کیا ہے فرماتے ہیں:

''پروفیسر محمد تقی امینی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات اور صدر شعبہ رہ چکے ہیں، ان کا شمار برصغیر ہند و پاک کے ان علماء میں ہوتا ہے جو اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں اور ان کی گہرائیوں سے نہ صرف باخبر ہیں بلکہ اس کا کماحقہ جواب دیتے اور علمی سطح پر اس کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ عام معنوں میں کوئی ایسے مفکر و محقق نہیں ہیں جو صرف عواطف اور جذبات کے زیر اثر لکھتے ہیں بلکہ ان کی تحریریں عقل و فکر اور گہرائی و گیرائی کی حامل ہوتی ہیں، ان کا قلم ایک ایسے ہتھیار کے مانند ہے جو دور حاضر کے الحادی فلسفوں اور نظریاتی الجھنوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے [۱۲]

ڈاکٹر صاحب موصوف ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''مولانا محمد تقی امینی صاحب اپنی ہر بات کا حوالہ نص سے دیتے ہیں اس طرح قاری آزاد فضا میں صرف پیڑ کی ڈالیوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا بلکہ پیڑ کی جڑوں (نصوص) سے پیوست رہ کر بھٹکنے نہیں پاتا۔ مولانا نصوص کو صحیح موقع و محل کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں اس طرح وہ فکر صحیح اور تصور سلیم کے قریب قریب ہی رہتے ہیں۔

مولانا کو قرآن وسنت کی گہرائیوں کے ساتھ ان انسان علوم و معارف کی بھی خبر ہے جو اجتماعی طور پر نوع بشری کی میراث ہیں مولانا نے اس عظیم انسانی وراثت سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اس کے عمدہ پہلوؤں سے استفادہ اور عالم انسانی تک آ کے عمدہ جواہر ریزوں کو پہونچانے کی بھی قدرت واستطاعت بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح انہیں صرف ایک سکہ بند مولوی کہہ کر نظر

اندازنہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ عقل سلیم اور عمیق نظر کے بھی حامل ہیں جو کائنات پر اس کی آفاقیت کے اعتبار سے نظر ڈالتے ہیں اور حق و باطل کے الجھاؤ میں حق کو پہچان کر باطل کو تہہ تیغ کرنے کی صلاحیت سے مسلح ہیں۔۱۳؎

مولانا سعود عالم قاسمی صاحب جو مولانا مرحوم سے نسبت خصوصی رکھتے تھے اور طویل عرصہ تک مولانا مرحوم کے علم وفضل سے استفادہ فرمایا رقمطراز ہیں۔

مولانا ممدوح حق گو اور جری شخص تھے حق بات کہنے میں وہ رشتے اور تعلقات نیز منصب وحیثیت کا لحاظ بالکل نہیں فرماتے تھے۔ وہ نقطہ نظر کی سختی اور مفاد پرستی دونوں سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کے قایل تھے۔ مولانا کی ذات دلگداز بھی تھی اور دلنواز بھی بالکل کھلی کتاب کی طرح ہر کسی سے بے لوث طریقہ سے ملتے۔ وہ مذہبی شخصیات اور جماعتوں سے الگ تھلگ رہ کر بھی ان سے دلی لگاؤ رکھتے تھے اور ان کے اچھے پہلوؤں اور کارناموں کا ذکر کرتے وہ یہ جملہ اکثر دہراتے ''میاں جیسا آدمی ویسا اس کا مذہب'' ساری جماعتیں ٹھیک ہیں کسی نے حق پر ہونے کا اللہ تعالیٰ سے پٹہ نہیں لکھوالیا ہے۔ مولانا اپنی ہر بات کا حوالہ ماضی سے ڈھونڈ کر لاتے تھے اور کہتے تھے میں اپنی بات گذشتہ علماء کی زبان سے کہتا ہوں اس لیے کوئی میری مخالفت نہیں کرتا، بعض لوگوں کو ان کے مسلسل اقتباسات اور حوالوں سے تکدر ہوتا اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے مگر مولانا اس راہ کی نزاکتوں سے واقف تھے اس لیے اس انداز تصنیف میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ رقمطراز ہیں:

''فراخ دلی وسیع المشربی، مروت، شرافت، سادگی اور اخلاص دردمندی اور عفو درگذر ان کی سیرت واخلاق کا نمایاں جوہر تھا۔ انھوں نے بڑی نرم وگداز طبیعت اور دردمند دل پایا تھا وہ ہر ایک کے دکھ درد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی ریا ونمود اور نمائش وبناوٹ سے خالی تھی، غیبت اور دوسروں کی عیب جوئی سے ان کو نفرت تھی ان میں کبر ونخوت اور علو وپندار کا شائبہ بھی نہ تھا

کہیں سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہ ہونے دیتے تھے اگر ان کو کبھی اس بات کا احساس ہو جاتا کہ ان کی کسی بات سے دوسرے کو تکلیف پہونچی ہے تو وہ بے تکلف اس سے اسی وقت معافی مانگ لیتے اپنی غلطی سے رجوع کرنے میں ان کو کوئی تأمل نہ تھا ایثار صبر وقناعت ان کا شیوہ تھا اپنے حال میں مست رہتے اور صبر وشکر سے گذر بسر کرتے۔

مولانا مرحوم مسلمانوں کے قدیم وجدید دونوں طبقوں میں مقبول اور ہر دل عزیز تھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی وہ ایک عالم دین اور اسلامیات کے بلند پایہ فاضل، محقق اور مصنف کی حیثیت سے پورے ملک میں مشہور تھے دینی علوم میں بلند پایگی کے ساتھ وہ اخلاص، عمل للّٰہیت اور بے نفسی اور زہد واتقاء میں بھی ممتاز تھے'' ان کی وفات سے دینی اور علمی حلقہ میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا بھرنا مشکل ہے۔

ہندوستان کے عظیم داعی، عالم اور مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مولانا امینی کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے اس کی وضاحت مولانا کے ایک مراسلہ سے ہوتی ہے جو انھوں نے تحقیقات شرعیہ کے قیام کے سلسلہ میں مولانا امینی مرحوم کو تحریر فرمایا تھا مولانا ندوی مرحوم اپنے مراسلہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

''صدق جدید میں ''تدوین فقہ جدید'' کے عنوان سے آپ کا فکر انگیز مراسلہ پڑھا جزاک اللہ خیراً عرصہ سے یہ خیال آرہا تھا کہ اس کام کے لیے ندوۃ العلماء ایک مناسب اور موزوں مرکز ہے، مخدوم محترم مولانا عبدالماجد صاحب کے نوٹ نے اس کی تائید کردی۔لیکن یہ کام جب ہی ہوگا جب آپ جیسا ایک فاضل جس کا ذہن اس موضوع پر کام کررہا ہے اس کام کے لیے فارغ ہوجائے یہ ایک مشترک دینی ضرورت ہے اور آپ کی حیثیت ایک صاحب فکر داعی کی ہے میری خواہش ہے کہ آپ کا ندوۃ العلماء سے تعلق برقرار رہے اور آپ کے لیے بھی اس سے زیادہ مناسب جگہ شاید مشکل سے پائی جاسکے''۔

اپنے ایک اور خط میں مولانا ندویؒ اس مجلس کے قیام کے سلسلہ میں مولانا امینی سے متعلق اپنے حسن ظن کا اظہار فرماتے ہیں۔

''میں مخلصانہ طریقہ پر آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قدیم وسیع اور معروف ادارہ (مراد ندوۃ العلماء ہے) سے آپ کی وابستگی تعلق اور اس کے وسائل کا حصول آپ جیسے صاحب صلاحیت عالم کے لیے بہت مفید اور اس کے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لئے معاون ثابت ہوگا۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی ایسا بڑا کام لے جو نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مفید ہو بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے بھی مفید اور وقت کا ایک اہم کام ہو۔[۱۴]

مذکورہ علماء اور اہل فکر و دانش کے اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا امینیؒ مرحوم کی شخصیت علم و فضل اور عادات و اخلاق کے لحاظ سے کس پایہ کی تھی ہم اس مقالہ میں انہیں کی برگزیدہ شخصیت کا تذکرہ لے کر بیٹھے ہیں مولانا کی سیرت و اخلاق اس تذکرہ کا باب اول تھا اب ہم اگلے باب میں مولانا کی اہم تصنیفات کا تذکرہ کریں گے اور ان کتابوں کی عظمت و اہمیت پر بقدر استطاعت روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

واللہ الموفق وھو المستعان

حواشی

۱ مراسلات حصہ اول، از مولانا محمد تقی امینی، ناشر فیکلٹی آف دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ اشاعت ۱۹۹۷ء

۲ ماہنامہ معارف ترجمان دارالمصنفین اعظم گڑھ، شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء بعنوان وفیات، ص ۲۳۰۔ از مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم

۳ الاسلام تشکیل جدید للحضارہ محمد تقی الامینی، ترجمہ ڈاکٹر مقتدی حسین ازھری، مراجعہ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس ص ۹ مطبع دارالعلوم للطباعۃ والنشر۔

۴ ماہنامہ تہذیب الاخلاق جلد ۱۰، شمارہ ۱-۲ جنوری، فروری ۱۹۹۱ء از محمد سعود عالم قاسمی۔

۵ حوالۂ سابق

۶ مراسلات علمی و دینی حصہ اول از محمد تقی امینی ص ۱۳۰

۷ تہذیب الاخلاق، حوالۂ بالا

۸ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ وفیات از ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۳۱۔

۹ تہذیب الاخلاق ص ۱۵ حوالہ بالا

۱۰ تہذیب الاخلاق ص ۱۵، حوالۂ سابق

۱۱ مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی ص ۵۹ مرتب نامعلوم

۱۲ عصر الالحاد خلفیتهٔ التاریخة وبدایة نهایته، مراجعة و تقدیم، عبدالحلیم عویس ص ۴-۵، دارالصحوہ للنشر والتوزیع

۱۳ تشکیل جدید للحضارہ ص ۷، محمد تقی امینی مراجعۃ، عبدالحلیم عویس، دارالعلوم للطباعۃ والنشر عام ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۲ء

۱۴ مراسلات علمی و دینی ص ۱۲۱-۱۳۰، مرتب مولانا تقی امینی

باب دوم

مولانا تقی امینی کی تالیفات ایک نظر میں

تمہید:

مولانا تقی امینی صاحب مرحوم ایک کثیر التصانیف صاحب قلم تھے۔ ان کا اصلی کارنامہ ان کی تصانیف ہیں۔ قدرت کی طرف سے لکھنے لکھانے کا ذوق انہیں فطری طور سے ودیعت ہوا تھا۔ ناگپور، اجمیر اور لکھنؤ کی علمی حلقوں سے وابستگی کی وجہ سے ان کا یہ فن خوب نکھرا اور آخر میں علی گڑھ کی علم پرور فضا میں ان کے اس ہنر کو خوب جلا ملی۔ ان کی کتابیں مولانا کی علمی اور دینی پختگی نیز اپنے مصنف کے وسعت مطالعہ اور دقیق النظری کی صاف گواہی دیتی ہیں انہیں خوبیوں کی وجہ سے ان کی بعض کتابوں کے عربی وانگریزی میں ترجمے بھی کئے گئے اور نہ صرف اندرون ملک، بلکہ بیرون ممالک کے فضلاء اور دانشوروں نے کھل کر داد دی۔ عالم عرب کی مشہور شخصیت ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مولانا کے بڑے مداحوں میں سے تھے اور انھیں برصغیر ہندوپاک کے جید اور ذہین علماء میں شمار کرتے تھے۔

مولانا تقی امینی کا اصل موضوع فقہ وقانون کی تشکیل جدید اور اس کی ازسرِ نو تدوین ہے مگر وہ حالات حاضرہ کے مسائل اور درپیش ملکی وملّی معاملات کو بھی نظرانداز نہیں کرتے انہیں بدلتے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا پورا احساس ہے میں اسی لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں اور سکہ بند علماء کو اپنا انداز فکرونظر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے مولانا مرحوم نے متعدد مقالات کے علاوہ ایک درجن سے زاید کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، یہ کتابیں اتنی وقیع اور بیش قیمت ہیں کہ مولانا کی سیرت پر لکھنے والا انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اس باب میں ہمارا ارادہ مولانا کی کتابوں کا ایک تعارف پیش کرنا ہے۔ تا کہ مولانا کی ذہنی رفعت وکمال کا انداز لگایا جاسکے۔ مولانا کی جو کتابیں بڑی جدوجہد کے بعد ہمیں مل سکی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱-اسلام کا زرعی نظام ۲-کائناب میں انسان کا مقام ۳-عروج زوال کا الٰہی نظام ۴-مذہبی

دور کا تاریخی پس منظر ۵- فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۶- مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر ۷- احکام شرعیہ میں حالت وزمانہ کی رعایت ۸- تہذیب کی تشکیل جدید ۹- انشورنش کی شرعی حیثیت ۱۰- امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں ۱۱- مقالات امینی ۱۲- حدیث کا درایتی معیار ۱۳- خطبات عیدین ۱۴- مراسلات علمی ودینی ۱۰- حکمت القرآن ۱۵- ہدایت القرآن اگلے چند صفحات میں انھیں کتابوں کا تعارف پیش نظر ہے۔

۱- اسلام کا زرعی نظام

یہ کتاب مولانا مرحوم کی باقاعدہ اولین تصنیف ہے جسے انھوں نے ناگپور کے دوران قیام میں مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر لکھی تھی۔ موضوع بالکل نادر اور اچھوتا تھا اس سے پہلے عربی زمان میں امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج اور کتاب الاموال لأبی عبیدہ وغیرہ تو موجود تھیں مگر اردو زبان میں اس موضوع پر باقاعدہ کوئی تصنیف نہیں تھی، اس میں اسلام کے نظام زراعت اور اسلام کے اقتصادی نقشہ زمین زراعت اور کاشتکاری کی حیثیت خلافت راشدہ میں تقسیم زمین کے اصول اور مشترک کھیتی اور بٹائی وغیرہ کی کیا صورتیں تھیں نیز اسلام کی روشنی میں ٹیکس، تحصیل اور وصول وغیرہ کے قوانین اور کسانوں کو دی جانے والی سہولیات افسروں کے انتخاب، رشوت بدعنوانی اور ظلم وجبر سے روکنے کے متعلق قوانین کو بحسن وخوبی بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے اپنی بات کا آغاز اس نکتہ سے کیا ہے کہ یہ زمین دراصل اللہ رب العالمین کی ملکیت ہے انسان چوں کہ اس زمین پر خلیفہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کی صیانت حفاظت اور انتظام وانصرام اس کے سپرد ہے اس زمین پر رہنے والی مخلوق الخلق عیال اللہ کے تحت اللہ کے عیال میں داخل ہے اس لیے اس پر تمام انسانوں کا بلافرق اعلیٰ وادنیٰ یکساں حق حاصل ہے اور سب کو اس زمین سے بقدر استطاعت وصلاحیت اپنا رزق حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ انھوں نے تقسیم پیداوار کا اسلامی طریقہ اختیار کیا ہے جس کی بنیاد عدل واحسان پر ہے اور روٹی اور

ملکیت کے وحشیانہ تصور پر کھل کر تنقید کی ہے۔

ملکیت کے اعتبار سے مولانا کے نزدیک آراضی کی تین قسمیں ہیں آراضی مفتوحہ اور آراضی معاہدہ نیز مسلمانوں کی آراضی اور ہر ایک کے الگ احکامات بیان کئے گئے ہیں نیز معاہدین اور مشرکین کے ساتھ اسلام نے عدل واحسان کے جو معاملات فرمائے ان کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے اور عہد نبوی اور عہد خلفاء کے مفتوحہ زمینوں کا سارا انتظام مفاد عامہ کے پیش نظر کیا گیا اور ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دی گئی، مکہ، خیبر، وادی قریٰ اور بنو قریظہ وغیرہ کی زمینوں سے لے کر عراق، شام، مصر، نجران وغیرہ کی سرزمینوں سے متعلق کھل کر بحث کی ہے اور اس نکتہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ، یہودیوں کو حجاز سے، نجرانیوں کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کی کیا وجہ تھی فرماتے ہیں۔

"دراصل نجران وفدک کے باشندوں نے پیغمبر اسلام کی زندگی سے معاہدوں کی خلاف ورزیاں اور خفیہ سازشیں شروع کردی تھیں۔ اسی بنا پر آپؐ نے فرمایا تھا۔

"آخر جو ا الیهود من الحجاز واخر جوا اهل نجران من جزیزة العرب [1]

پھر اس امر کی علت بیان کرتے ہوئے ابوعبیدہ لکھتے ہیں۔

انما نراه قال ذالک صلی الله علیه وسلم لنکث کان منهم او لائر أحدثوه بعد الصلح وذلک بیّن فی کتاب کتبه عمر قبل جلاء ه ایاهم منها [2]

قاضی ابو یوسفؒ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

لانه خافهم علیٰ المسلمین [3]

یعنی خلیفہ عمرؓ کو نقض امن اور مسلمانوں کے جان و مال کا خطرہ تھا۔

مولانا مزید فرماتے ہیں:

"اس کے باوجود منتقل کرنے کے بعد ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کیا گیا تھا اور حقوق ومراعات دیئے گئے تھے" [4]

اس کے بعد مولانا نے پوری تفصیل سے پابندی عہد کے نظائر و امثال بیان کیے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اسلام نے عدل واحسان کے معاملہ میں کسی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے۔۵

صاحب زمین کے اختیارات، آراضی کی آباد کاری کی شکلیں، بنجر زمینوں کا حکم، قدرتی پیداوار والی زمیں، چراگاہوں کا انتظام، جنگلات کا انتظام، جھیلوں، چشموں اور معدنیات کے ذخائر وغیرہ سے متعلق مباحث، زراعت و باغبانی کے اقسام بٹائی پر کھیتوں کے دینے کا معاملہ اور اس کے اقسام، آب پاشی کے متعلق شرعی احکام، چشمہ نہر تالاب اور حوض وغیرہ کے متعلق احکام ٹیکس اور تحصیلات کا نظام اور ان کے مصارف لگان وغیرہ کے سلسلہ میں اسلامی قوانین اور افسروں کی تقرریاں وغیرہ۔

اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تمام باتوں کے لیے مستند حوالے پیش کیے گئے ہیں مولانا خود فرماتے ہیں:

''اس کتاب میں بالخصوص اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی چیز بغیر معتبر سند کے نہ پیش کی جائے اس سلسلہ میں متعدد کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔ ان کے مصنفین کا ممنون احسان مند ہوں اور ان احباب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مضمون کی فراہمی اور مسودہ کی ترتیب میں میری مدد کی ہے۔۶

مولانا مرحوم کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے لائبریریوں اور علمی حلقوں سے دور رہ کر اس کتاب کو مرتب کیا اور معتبر و مستند حوالوں سے اسے سجایا اور ایسے موضوع پر دادِ تحقیق دی جو نہایت ضروری اور اچھوتا موضوع تھا۔ فجزاہ اللہ عنّا و عن المسلمین. خیراً

۲- اسلام اور جدید دور کے مسائل

مولانا کی یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو الگ الگ بھی چھپے ہیں اور کئی مضامین کی

یکجا اشاعت بھی ہو چکی ہے مثلاً اس مجموعہ کے پہلے تین موضوعات یعنی اجتہاد، فقہ کی تدوین جدید اور فقہ کے اجتماعی مسائل یکجا طور پر مقالات امینی کے نام سے ۱۹۶۲ء میں ہی شائع ہو چکے تھے چنانچہ کتاب ''مقالات امینی'' کے ناشر نے اس کتاب کا تعارف یوں کرایا ہے:

اجتہاد تدوین فقہ جدید اور فقہ کے اجتماعی مسائل پر مولانا محمد تقی امینی کے وہ مقالات جو دسمبر ۱۹۶۰ء تھیالوجیکل سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی دعوت پر یونین ہال میں پڑھے گئے۔

یہ تینوں مقالات اپنی جگہ پر نہایت اہم ہیں ان مقالات کا مقصد اسلامی فقہ کے جمود و تعطل کو ختم کر کے اجتہاد کا بند دروازہ کھولتا ہے دراصل مولانا کو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں کا پورا احساس تھا اس لیے انھوں نے قدیم و جدید ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کو اجتہاد کے نشیب وفراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جانے لگا ہے مثلاً یہ کہ مولانا نے بہت پہلے شورائی اجتہاد کو اس دور کے لیے مناسب بتایا تھا اور اب اس کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے۔ یہ جگہ جگہ ہندوستان اور بیرون ہند میں پھیلی ہوئی فقہی اکیڈمیاں اور ان کے تحت منعقد ہونے والے سیمینار اور جدید مسائل پر بحث و تمحیص اس پر گواہ ہیں غرض غور وفکر، اجتہاد اختراع اور تفریع واستنباط جو اس امت کا خاص وصف و امتیاز تھا مسلمانوں کے اسی تاریخی کردار کو مولانا نے پوری تفصیل کے ساتھ ان مقالات میں قلمبند فرمایا ہے۔

ان بنیادی موضوعات کے علاوہ مولانا نے جن اہم عصری مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے وہ یہ ہیں مسئلہ ملکیت آراضی، ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر، اخلاف مطالع، سٹہ بازی اور اسٹاک ایکسچینج پر خرید و فروخت کا مسئلہ، مشترکہ سرمایہ کمپنیاں، حصص شیرز کے مسائل تمسکات یا باؤنڈز کی شرعی حیثیت جدید استحصالات کی قسمیں، بیمہ یا انشورنش کی شرعی حیثیت اس کی قسمیں اس کی جائز اور ناجائز شکلوں کے بارے میں محاکمہ' بیع اور اس کی اقسام عقود اور معاہدات، اسلام نے بیمہ کے مسائل کو

حل کرنے کے لیے کیا انتظامات فرمائے ہیں اس سلسلہ میں عاقلہ، قسامہ، عقد موالات، حلف، ولاء وغیرہ کی جاہلی شکلوں کو برقرار رکھنے اور اسلامی دفعات میں مسلمانوں کی جان و مال کے حفاظت سے متعلق مختلف شکلوں کا تذکرہ ہے، جس میں منجملہ ان مسائل کے حل کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر اور اسلامی حکومت قائم نہ ہونے کی شکل میں مسلمانوں کی مختلف تنظیموں پر اس کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔

مزید برآں اس کتاب میں عورتوں کے مسائل اور ان کی مشکلات اور ان کے مسائل کے سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی خاموشی، اسلحہ کی دوڑ، ایک اور تہذیب جدید کی ضرورت جس میں قرآن کو دستور اساس اور مطلق حاکمیت اللہ رب العزت کو حاصل ہو، سیکولر قوانین پر تنقید، اجتہاد و استنباط کے لیے حدیث کا تنقیدی مطالعہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور مفاہمت بین المذاہب جیسے دقیع اور اہم موضوعات پر مولانا کی قیمتی اور مفید آراء شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ سے دل و دماغ کی بند گرہیں کھلتی ہیں اور اسلامی اصول و معتقدات پر جدید ذہن مطمئن اور پر اعتماد نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں بلکہ مولانا کی ساری کتابوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا کوئی بات بھی بلا دلیل نہیں کہتے۔ معاملہ چاہے قرآن و حدیث، فقہ، سیرت یا تاریخ یا جدید مسائل سے ہو مولانا کا قلم گو ہر بار ہر بات کی سند و شہادت اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر بیمہ یا انشورنش کی تاریخ کے بارے میں مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اور جس طرح یورپین علماء کے حوالے رقم فرمائے ہیں ان سے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی مولوی محض کی تحریر ہے بلکہ اس سلسلہ میں قرآن و حدیث اور فقہی نصوص کے حوالوں کے ساتھ عہد عالمگیری کے منشی سوجان رائے، ڈر پیسر انیز دیگر یورپی محققین اور تاریخ نگاروں کے فرمودات جو مولانا نے نقل کئے ہیں ان سے ان کی وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔[۸]

اس کتاب کا آخری باب مفاہمت بین المذاہب ہے جو آج کل پوری دنیا کا ایک دلچسپ موضوع ہے مولانا کی رائے ہیں مفاہمت بین المذاہب کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر گروہ اپنا

موقف چھوڑ کر دوسرے گروہ کا موقف قبول کرے کیوں کہ ہر مذہب والوں کا یہی کہنا ہے کہ وہی سچ پر ہیں اور اگر کسی موقف کے اپنانے پر اصرار کیا جائے تو بجائے مفاہمت کے مجادلت شروع ہوجائے گی۔مولانا اس سلسلہ میں قرآن کا موقف یوں پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم سب سے پہلی کتاب ہے جس نے مفاہمت بین المذاہب کی بنیاد رکھی اور اس راہ کی مشکلات درج ذیل طریقوں سے دور فرمائی۔

۱- اعلان کیا کہ مذہب کے معاملہ میں کسی جبر و اکراہ کی گنجائش نہیں

۲- ہر قابل ذکر مذہب کی بنیاد تسلیم کی اور یہ اعلان کیا کہ لوگ ایک ہی امت تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے انبیاء و رسل مبعوث فرمائے جو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری تا کہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کرنے والی ہو۔

۳- ہر مذہب کی بنیاد 'توحید' پر ہے اور اللہ کے شریک و سہیم کی کوئی گنجائش نہیں۔

۴- ہر مذہب میں بنیادی تعلیمات عام طور پر ایک ہی ہیں۔

۵- مذہب کی بنیادی تعلیم کے ساتھ مذاہب کی مختلف شکلوں میں رواداری برتنے کا حکم دیا پھر ان تعلیمات پر خود مذہب اسلام کے پیروکاروں نے کسی حد تک عمل کیا اس کی مثالیں تاریخ و سیرت اور احادیث صحیحہ کے حوالوں سے ثبت قرطاس کی ہیں۔ ۹

یہ کتاب بھی دور جدید کے مسائل اور ان کے اسلامی حلول کے سلسلہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور جدید دور کی اکثر ضرورتوں کو بخوبی پوری کرتی ہے۔

یہ کتاب مکتبہ فیض القرآن دیوبند ضلع سہارنپور یوپی سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی ہے اور یہ اس پاکستانی ایڈیشن کا عکس ہے جس کا کوئی حوالہ کتاب میں موجود نہیں ہے۔

۳- تہذیب جدید کی تشکیل

تہذیب جدید کی تشکیل مولانا مرحوم کی ایک اور وقیع اور مہتمم بالشان کتاب ہے جس میں تہذیب کے نئے دعویداروں یورپ اور امریکہ کو آئینہ دکھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ تہذیب جو اپنی چمک دمک اور روشن خیالی پر خود نازاں ہے اس کی بنیادیں بہت کمزور اور کھوکھلی ہیں دراصل تہذیب کی مضبوط بنیادیں اسلام نے فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور آٹھ فصلوں پر محیط ہے جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

مقدمہ

فصل اوّل

۱- تشکیل جدید

۲- فصل دوم عملی تشکیل

۳- فصل سوم ماورائی ذہنیت

۴- فصل چہارم شخصی وانفرادی زندگی

۵- فصل پنجم عائلی تنظیم

۶- فصل ششم معاشرتی نظام

۷- فصل ہفتم معاشی نظام

۸- فصل ہفتم سیاسی نظام

حالانکہ خود مولانا مرحوم نے ان مباحث کو فصلوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔لیکن اس کتاب کے عربی مترجم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن یاسین ازہریؒ نے اسے جدید انداز میں فصلوں میں مرتب کر کے ہی شائع کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترتیب مولانا کے مشورہ سے ہی کی گئی ہوگی۔

مقدمہ میں مولانا نے تہذیب کے قدیم ترین مصادر یونان وروما کی تہذیبوں پر گفتگو کرتے

ہوئے یہ ثابت کیا ہے مغربی تہذیب کی نفسیاتی بنیادیں اگر چہ یونان وروم سے ماخوذ ہیں مگر مغرب کی سائنس ترقی کی اصل بنیاد مشرق سے ماخوذ ہے مولانا RJ.Tin B کے حوالہ سے رقمطراز ہیں

''قرن وسطیٰ کے مغربی مسیحیوں نے اپنے معاصر اہل علم کی تحقیق وتفتیش کے نتائج سے پورا فائدہ تھایا بلکہ طریقۂ اعداد کے اس نظام سے بھی فائدہ اٹھایا جو عام طور پر عربی کہلاتا تھا''۔۱۰

مولانا نے مقدمہ میں قدیم وجدید دونوں حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ تہذیب کی تشکیل جدید کی بنیاد دراصل اسلام نے ہی فراہم کی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی رہنمائی موجود ہے۔

فصل اول میں تہذیب کی بنیاد کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس میں تہذیب کی حقیقت اور تہذیب کی وسعت و ہمہ گیریت پر کلام کیا گیا ہے، اسلامی اور مغربی تہذیب کی تشکیل جدید میں انسانی نفسیات انسان کی حیثیت ، انسان کی روحانی قدر و قیمت اور تہذیب کی ساخت پر اس روحانیت کے پڑنے والے اثرات جب کہ مغربی تہذیب کی بنیاد مجرد انسانی تعقل پر رکھی گئی ہے جو باعتبار وجوہ ناقص اور محدود ہے اور فصل کے آخر میں اس بابت کلام کیا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کو مغربی تہذیب پر کن وجوہات سے تفوق اور برتری حاصل ہے۔

فصل دوم میں انسان اور کائنات کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا ہے اس پر کلام کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد ایمان باللہ، انسانوں کے درمیان محبت اور عمل صالح پر قائم کی گئی ہے جو انسانوں کے درمیان آپسی سلوک اور رویہ کو طے کرتی ہیں اور یہی چیزیں اس کائنات کے نظم وارتقاء کی بنیادیں جو نہ صرف تہذیب انسان کی بہترین تشکیل کرتی ہیں بلکہ اسے اوج کمال پر پہونچادیتی ہیں۔

تیسری اور اس کے بعد کے فصلیں دراصل دوسری فصل کا تتمہ اور تکملہ ہیں اس لیے یہ فصلیں مکمل طور پر منضبط اور مربوط ہیں ان میں اس بات پر کلام کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن اور تہذیب کی انفرادیت کیا ہے؟ اور وہ کس طرح سے فرد کو معاشرہ سے جوڑتا ہے۔ اس فصل میں عقل وقلب کا مقابلہ وحی الٰہی سے کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلہ میں یہ وسائل انسانی تہذیب جدید

کی تشکیل میں کس قدر ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہیں اور اس کے بعد یہ نکتہ بیان کیا گیا۔ ہے کہ انسانی تہذیب کے مختلف میدانوں میں وحی الٰہی نے ہماری کس طرح رہنمائی فرمائی ہے اور انسانی تہذیب کی اکائیوں کے ارتباط وانسجام کو بیان فرمایا ہے۔

انسان کی انفرادی زندگی کے حوالہ سے فصل چہارم میں کلام کیا گیا ہے کہ فرد اپنی ذاتی حیثیت میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ مثلاً عدل، احسان، کرم، حلم وغیرہ کو اپنا کر وہ کس طرح ایک معاشرہ کو مضبوط معاشرہ اور ایک سوسائٹی کو توانا سوسائٹی بناتا ہے۔

پانچویں فصل میں انسانی زندگی کے شادی شدہ حصہ کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اسلامی اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کے درمیان مقابلہ کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی ازدواجی زندگی کس مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور مغرب میں انسان کے اسری نظام کو جو تہذیب کی بنیاد ہے کس طرح تیاپانچہ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ان حقوق ومراعات کا حوالہ بھی آ گیا ہے، جو اسلام نے عورتوں کو دیئے ہیں جب کہ مغرب نے صرف عورتوں کا استحصال کیا ہے۔ اور انہیں مردوں کے لیے کام کرنے کی ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔

چھٹی فصل میں انسان کی معاشرتی حیثیت پر کلام کیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ تہذیب جدید یا مغرب انسانی معاشرہ کو مستحکم بنیادیں فراہم کرنے میں کس طرح ناکام رہا جب کہ اسلام نے اس کی معاشرتی بنیادیں کس قدر مستحکم رکھی ہیں اور اس کے حقوق واختیارات اور واجبات و فرائض کی عادلانہ تقسیم کر کے مخلوق کو خدا کا کنبہ بنا دیا ہے اور کائنات سے متعلق اس کو ذمہ داریاں عطا کر کے انسان کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ شہری کی حیثیت عطا کی ہے۔

ساتویں فصل میں اسلام اور مغرب کے اقتصادی نظاموں کا تعارف کراتے ہوئے یہ دکھایا گیا ہے اسلام نے اس سلسلہ میں سرمایہ دارانہ اور مارکسی نظریات کی خامیوں کو کس طرح اجاگر کیا ہے اور اقتصاد کی اصل بنیاد یعنی وسائل کی تنظیم وتقسیم کو کس طرح منضبط کیا ہے اور ہر شہری کو غذا،

لباس، مکان، علاج، تعلیم اور شادی بیاہ وغیرہ کے مسائل کا کتنا آسان اور قابل حل عمل پیش کیا ہے جس سے گروہ انسانیت نہ صرف مادی مسائل کی الجھنوں سے نجات پا کر اپنے اصل مقصد زندگی یعنی اپنے رب کی عبادت ہی کو اپنا مقصد وجود ٹھہرائی ہے بلکہ مادی معیار سے بلند ہو کر روحانی آفاقیت میں ضم ہو جاتی ہے۔

آٹھویں اور آخری فصل نظام سیاست سے متعلق ہے جو انسانی تہذیب کا منتہائے کمال ہے جدید ترقی یافتہ دور میں میکاولی نظام سیاست وہ آخری اوج ہے جہاں تک تہذیب جدید پہونچ سکی ہے اور جس کا مظہر اور مابہ الامتیاز وہ نظام جمہوریت ہے جو آج دنیا کے مختلف قوموں میں اپنی مختلف شکلوں میں موجود ہے مولانا نے اس مغربی طرز سیاست پر تنقید کر کے بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ مغرب کا تصور حکمرانی بوجوہ ناقص ہے اوّلاً اس لیے کہ آج تک جمہوریت کی کسی تعریف پر اتفاق نہ ہو سکا۔ دوم اس لیے کہ جگہ اور ہر حالت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے ہی ہمیشہ حق اور صائب ہو تیسرے یہ کہ اس کی جڑوں سے نیشنلزم اور قوم پرستی کا جو ناگ نکلتا ہے اس کا زہر بہت خطرناک ہے جو انسانیت کو ایسا ڈستا ہے کہ اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے جب کہ اسلام کا نظام حکمرانی خدا کی حاکمیت اعلیٰ اور شورائی پارلیمنٹ سے عبادت ہے جو قوموں کے اصول سیاست کو نیا موڑ دیتا ہے اور قوم، طبقہ اور رنگ و نسل کے عفریتوں کے چنگلوں سے نکال کر انسانیت کو وحی ربانی کی روحانی فضاؤں سے آشنا کراتا ہے۔

بہر حال یہ کتاب اقوام عالم کے لیے تہذیب کی تشکیل جدید میں اسلام کی طرف سے ایک چیلنج ہے اور دنیا کو ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

حدیث کا درایتی معیار:

مولانا کی کتاب ''حدیث کا درایتی معیار'' علم حدیث کے ایک اہم موضوع پر ایک دقیع تصنیف ہے دراصل نقد حدیث کے سلسلہ میں راوی اور مروی دونوں ہی اہم ہیں مگر بدقسمتی سے

مروی یعنی احادیث کے متن پر تنقید اس انداز میں نہ ہوسکی جس کی ضرورت تھی جب کہ عام طور سے سند حدیث کو ہی موضوع بحث بنایا گیا۔ اور اس سلسلہ میں محدثین عظام نے کافی ذخیرہ چھوڑا اور اسناد کے نقد کے سلسلہ میں کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے دیا گیا جب کہ نقد متن کے سلسلہ میں اگر چہ اصول اور بنیادیں ہمارے اسلاف نے فراہم کردی تھیں مگر تفصیلی کام ہنوز باقی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مضبوط سند والی ضعیف متن پر مشتمل کسی حدیث کو علماء نے ضعیف اور غیر مستند ٹھہرایا تو علم حدیث کے سکہ بند علماء نے ان پر منکر حدیث اور خارج از اسلام ہونے کا فتویٰ لگانے میں تاخیر نہیں کی جب کہ علم حدیث کا یہ عام اور متفق علیہ اصول ہے کہ صحت سند صحت متن کو مستلزم نہیں ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ حدیث کے ٹھیکیداروں نے اس اصول کو ماننے کے باوجود اس پر عمل کرنے والوں کو حدیث کا مخالف ٹھہرایا اور عام معاملات میں تقلید کی مخالفت کرنے والے اس سلسلہ میں بدترین تقلید کا شکار ہوئے۔

مولانا تقی امینیؒ نے یہ کتاب لکھ کر یہ واضح کیا ہے کہ صحیح اور ضعیف حدیثوں میں امتیاز کے لیے محدثین نے روایت کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کئے تھے لیکن روایت کے مقابلہ میں درایت پر کم توجہ دی گئی خصوصاً اردو زبان میں تو اس موضوع پر بہت کم کام ہوا۔ جس کا فرض کفایہ مولانا نے ادا کیا ہے۔ مولانا رقم طراز ہیں۔

ہماری زبان میں تو روایت حدیث پر کام ہوتا رہا لیکن درایت حدیث پر کام کا تسلسل جاری نہ رہ سکا جس کی وجہ سے حدیث کی شناخت اور موقع ومحل کی تعین میں دشواری پیش آتی رہی اور حدیث کی افادیت گویا ایک دور وزمانہ تک محدود رہ گئی۔ ادھر مستشرقین نے نقد حدیث پر جس انداز سے کام کیا۔ اس میں حدیث کی اصل صورت ہی مسخ ہوگئی۔ جس کے بعد قرآن فہمی اور اس کی تشریح و توضیح کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہا جس کی صحت کی ضمانت ہو۔ [۱۱]

کتاب کے آغاز میں نبوت کی مختلف حیثیتوں پر کلام کیا گیا ہے۔ یہ قضیہّ بڑی اہمیت کا

حامل ہے۔اس کا مقصد نبوت ورسالت کی اہمیت اور نبی اور رسول کی عظمت کو واضح کرنا ہے اس کے تحت مختلف عنوانوں پر کلام کیا گیا ہے مثلاً تخم نبوت،قرب نبوت یعنی وقت نبوت، ختم نبوت، علم نبوت، اور شعور نبوت وغیرہ یہ موضوعات دراصل تمہید ہیں اس اہم مضمون کا جس کے ذریعہ ان نورانی شعاعوں کی تفصیل سے پہلے اس کے اصل مرکز یعنی نبوت سے جوڑا جائے۔اس میں مولانا کے نزدیک شعور نبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے چنانچہ اس کی وضاحت انھوں نے اس مقام کے علاوہ بھی اپنی تحریروں میں مختلف مقامات پر کی ہے۔اس موضوع پر ان کی تحریروں کا حاصل یہ ہے کہ نبی کو من جانب اللہ علم وادراک فہم وبصیرت اور حکمت ونورانیت عطا ہوتی ہے اور امور دین سے متعلق نبیؐ کے تمام ارشادات وحی الٰہی سے مستنبط ہوتے ہیں۔ظاہر ہے کہ کتاب میں منصب نبوت ،پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم وفہم اور حکمت وشعور کی یہ مبسوط اور فاضلانہ بحث اس لیے کی گئی ہے کہ نبوت کے سرچشمۂ فیض سے جاری ہونے والی حدیثوں کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت پوری طرح سامنے آجائے۔

ان تمہیدات کے بعد کتاب کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے جس پر علم حدیث اور نقد حدیث کے عنوان کے اظہار خیال کیا گیا ہے۔اس حصہ میں مصنف نے درایت کا مفہوم اور قرآن مجید، احادیث نبوی اور اقوال صحابہ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کر کے اس بارے میں محدثین کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے۔مولانا کے نزدیک سند حدیث یعنی راویوں کے حالات کی چھان بین اور صحت وضعف سے متعلق ان کی آرا خارجی نقد حدیث کہلائے گی۔جب کہ روایت کے مضمون ومتن پر نقد وجرح کر کے اس کی قوت وضعف کا فیصلہ کرنا داخلی نقد حدیث کہلائے گا۔مولانا کی رائے میں اگر ان دونوں میں ٹکراؤ ہو تو اولاً ان میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اگر تطبیق ناممکن ہو تو درایت کو روایت یعنی سند پر کو فوقیت اور ترجیح حاصل ہوگی۔

مولانا نے اس موضوع کو پھیلاتے ہوئے محدثین اور فقہا میں یہ فرق واضح کیا ہے کہ فقہا

کہ اصل توجہ داخلی نقد حدیث یعنی درایت کی طرف تھی جب کہ محدثین نے علم اسناد پر خصوصی توجہ کی جب کہ داخلی نقد حدیث یعنی درایت کو انھوں نے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ داخلی نقد حدیث کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ اس کے لیے دراصل فنی ذوق کی ضرورت ہے۔ اس لفظ سے چونکئے نہیں کیوں کہ یہی الفاظ بعینہ مولانا مودودیؒ نے بھی اپنے مضمون ''مسلک اعتدال'' میں استعمال کیا تھا جسے علم حدیث کے نام نہاد ٹھیکیداروں نے تل کا تاڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا تھا۔ مولانا امینی نے عادت کے موافق اس کے لیے بھی حوالے دیئے ہیں۔ مولانا ابن دقیق العیدؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کی بکثرت ممارست سے ایک خاص قسم کی نفسی کیفیت حاصل ہوتی ہے اور ایسا مضبوط ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ نبوت کے الفاظ کی معرفت ہوتی ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں''۔

علامہ بلقینیؒ کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''اگر ایک شخص کسی کی برسوں خدمت کر کے اس کی پسند و ناپسند کی واقفیت حاصل کر لے اور پھر کوئی اس کی پسندیدہ شئے کے بارے میں کہے کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے تو سننے کے ساتھ ہی اس کو جھوٹا قرار دے دے گا اور اس کے لیے وہ مزید تحقیق کی ضرورت بھی نہ سمجھے گا''۔[۱۲]

اس کے بعد مولانا نے داخلی نقد حدیث کے اصول وضوابط بیان کئے ہیں جن میں یہ باتیں خاص ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیثوں میں لفظی یا معنوی رکاکٹ نہ پائی جائے، ان میں مختلف پیشہ اختیار کرنے والوں یا کسی خاندان، شہر، قوم یا شخص کی برائی نہ ہو۔ اسی طرح اس میں تمسخر استہزاء اوٹ پٹانگ اور کم عقلی کی باتیں بھی نہ پائی جائیں۔ اس طرح آپ کی طرف منسوب حدیثیں کلام انبیاء کے شایان شان ہونی چاہئیں عام مشاہدہ اور واقعہ کے خلاف نہ ہوں، عقل، تاریخ، طبی، اور سائنسی حقائق کے خلاف نہ ہوں، شرک اور عقائد باطلہ سے پاک ہوں، چھوٹے کام پر بہت بھاری ثواب اور چھوٹی بات پر سخت وعید کا مبالغہ نہ ہو، اسی طرح وہ حدیثیں جو

عصبیت اور اختلاف کو ہوا نہ دیتی ہوں، جن میں مذہب اور مسلک کے اختلاف کو ہوا نہ دی گئی ہو، شہوت پرستی اور غیر اخلاقی تعلیمات کے منافی ہوں۔ یہ وہ معیارات ہیں جو داخلی نقد حدیث کے سلسلے میں اسلاف نے بیان کئے ہیں اور مولانا کا ان سے پورا اتفاق ہے۔

لیکن واضح رہے کہ مولانا کے خیالات سے بہت سے اہل علم نے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً مولانا کی یہ رائے کہ ثقہ راویوں سے منقول مستند کتب حدیث کی روایتیں اگر شان نبوت کے منافی ہوں گی تو یہ قابل رد ہوں گی۔ اسی طرح نسخ کے بارے میں مولانا یہ فرمانا کہ اس کا تعلق قدیم آسمانی کتابوں سے ہے قرآن مجید سے نہیں۔ مولانا کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کے احکام میں ردّ و بدل کا تعلق ذات سے نہیں بلکہ اوصاف سے ہے اور اس کے لیے مولانا نے حضرت عمر فاروقؓ کے بعض فیصلوں کو دلیل بنایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس فرق کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے ہی حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کی نوعیت اور حکمت لوگوں پر واضح نہ ہوسکی اور انھوں نے اسے قرآن کے فیصلوں میں ردّ و بدل پر محمول کرلیا حالانکہ حضرت عمرؓ کی رائے قرآن وحدیث کی روح سے غیر ہم آہنگ نہیں ہوسکتی۔

بہر حال مولانا کی یہ کتاب حدیث کے داخلی نقد پر ایک اہم کتاب ہے جو حدیث کے اس پہلو پر غور وفکر کرنے والوں کے لیے راہیں ہموار کرتی ہے اور حدیث کی خدمت کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے۔

۵- احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت:

مولانا تقی امینیؒ صاحب کی یہ کتاب دراصل فقہ کے جمود و تعطل کو ختم کرنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی طرف ایک قدم ہے دراصل مولانا کو بدلتے ہوئے حالات اور شرعی احکام کے انطباق کی نزاکتوں کا شدید احساس ہے اس لیے انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو اس شدید جمود و تعطل سے نکال کر غور وفکر، اجتہاد و استنباط اور تفریع و تجزیہ کے ان اہم اصولوں کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے کہ جو کبھی اس امت کا امتیاز اور وصف خاص ہوا کرتا تھا۔ مولانا

کے اندر یہ احساس شدید ہے کہ اگر ہم موجودہ زمانہ میں اسلام کو غالب اور نافذ دیکھنا چاہتے ہیں تو موجود احوال و مسائل اور پیش آمدہ امور کا سامنا کیے بغیر ممکن نہ ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں:

''مسلم قوم نے جس نئی دنیا میں قدم رکھا ہے اگر اس میں رہنا اور چلنا ہے تو اس کے احساس و خیالات کو سمجھنا ضروری ہے اور اس کے تقاضوں اور مطالبوں کو قبول کرنا ناگریز ہے۔ حصول مصالح کی بہت ساری شاہ راہیں تعمیر ہو چکی ہیں، معاشی اسکیموں اور فلاحی تجویزوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے۔ صنعت و حرفت کی وسیع پیمانہ پر تنظیم ہو چکی ہے اور تجارت و زراعت کی نئے انداز میں تشکیل ہو چکی۔ اور اب بات صرف حاجات و ضرورت پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ جلب منفعت اور دفع مضرات کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لیے زندگی کے موجودہ سروسامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے۔[۱۳]

لیکن اس کام میں بڑی دشواریاں کیا ہیں؟ مولانا لکھتے ہیں:

موجودہ دور کی تبدیلیوں کو سمیٹنے کے لیے قرآن وسنت کی روشنی، صحابہ کی زندگی اور فقہاء کرام کے اجتہادات سب محفوظ ہیں لیکن ان سے استفادہ کی راہ میں چند دشواریاں حائل ہیں جو مجملاً مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) موجودہ دور میں مذہب کی نمائندگی جن ہاتھوں میں ہے انہیں فکر و عمل کی اس پائمالی کا احساس ہی نہیں ہے، وہ یہ تو مانتے ہیں کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے لیکن جب اس کی تعبیر و تفسیر کا معاملہ آتا ہے تو سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ مظاہرہ سے وہ نہیں چوکتے۔ مولانا جدید اہل قلم کی خدمات کا اعتراف بھی کرتے ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ عام طور سے ان کی جولانیوں کا دائرہ کار عقائد و عبادات سے آگے نہ بڑھ سکا اور جن لوگوں نے بعض اجتماعی اور معاشی معاملات میں قلم اٹھایا تو معاشرہ کی طرف سے انہیں سند قبولیت نہ عطا ہو سکی۔

(۲) شریعت اور دنیاوی امور کو الگ الگ سمجھنے کی وجہ سے یہ قوانین اب تک اپنی کوئی افادیت نہ

ثابت کرسکی اور معاملہ صرف زبانی موشگافیوں تک ہی محدود رہا۔

(۳) موجودہ ترقیات اور بدلتے ہوئے حالات سے مرعوبیت والی ذہنیت نے دوطرح کے طبقات پیدا کردئے ہیں ایک طبقہ تو وہ ہے کہ جو شرعی حدود و قیود کو نظر انداز کر کے سب کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہے جب کہ دوسرا طبقہ بدلتے ہوئے حالات پر ماتم کر کے گریز وفرار کی راہ اختیار کئے ہوئے ہے ان دونوں کو طبقات کے درمیان ایک تیسرا طبقہ بھی ہے جس میں کسی نہ کسی حد تک توسط واعتدال پایا جاتا ہے مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ عملی لحاظ سے یہ طبقہ معدوم ہے اوران کے تمام ترجذبات ورجحانات محض خواہشات اور ''ذاتی پسند'' تک محدود ہیں جو معمولی آزمائش کے وقت نہایت نیک نامی کے ساتھ دب جاتی ہیں اور پھر چند دنوں کے لیے ابھر آتی ہیں ان خواہشات کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی موثر طاقت ہے نہ بے چین کردینے والا احساس۔

(۴) ایک اور شدید مانع مذہب کے نام پر بنی ہوئی مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں بھی ہیں جو لوگوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں جن سے صرف نظر کرنا مذہبی حلقوں کے لیے بہت مشکل ہے اگر وہ ایسا کریں گے تو ان سے تعلق رکھنے والا مذہبی حلقہ ٹوٹ کر بکھر جائے گا اور وہ اکیلے اور تنہا رہ جائیں گے۔[۱۴]

بہر حال ان شدید موانع اور دشواریوں کے باجود **معذرةً الی ربکم** کے تحت مولانا نے یہ کتاب رقم فرمائی اور معتبر اور مستند حوالہ جات کے ساتھ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت کے پہلو کو منقح فرمایا۔

کتاب میں شرعی احکام میں حالات وزمانہ کی رعایت کے پہلو کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید، سنت رسول، عہد صحابہ کے واقعات اور شیخین یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے فیصلوں سے نظایر پیش کئے گئے، فقہاء کی تفریعات کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کردیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز شریعت کے ایک بہت ہی اہم اصول ''نسخ'' سے ہوا ہے مولانا اسلام

میں نسخ کے قائل نہیں ہیں ان کے نزدیک نسخ دراصل موقع ومحل کی صحیح تعین کا نام ہے۔ یعنی وہ خاص حکم جو کسی زمانہ میں شریعت کا جزو رہا ہو حالات کے بدل جانے سے وہ منسوخ نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر عمل موقوف ہو جاتا ہے لیکن اگر پھر اسی طرح کے احوال وظروف عود کر آئیں تو وہی موقوف شدہ حکم دوبارہ قانون کی شکل اختیار کرے گا۔ مولانا امینیؒ نے اس رائے کی تائید کے لیے بڑے بڑے علماء کے اقوال نقل کئے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں وہ علامہ آمدی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

جب زمانہ کے اختلاف سے مصالح کے اختلاف کا جواز معلوم ہو گیا تو یہ بات ممتنع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی مصلحت کے مطابق کسی زمانہ میں کوئی حکم دے اور جب مصلحت بدل جائے تو اس سے منع کردے جس طرح ایک طبیب کسی زمانہ میں کسی دوا کا حکم دیتا ہے اور جب اختلاف مزاج کے وقت مصلحت بدل جاتی ہے تو اس دوا کے استعمال سے روک دیتا ہے۔ ۱۵

غرض مولانا نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور مختلف مثالوں کے ذریعہ اپنی بات ثابت کی ہے مثلاً اسلامی حکومت میں سلطنت واقتدار کی کیا شکل ہو؟ اس کی کوئی خاص شکل متعین نہیں ہے بلکہ اس میں صرف یہ اصول کارفرما ہوگا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ کی ہوگی اور سلطان یا ولی اس نظام کا امین ہوگا بقیہ انتظامی معاملات کے لیے اسے شورائی نظام اختیار کرنا ہوگا جو مختلف حالات وظروف کو دیکھ کر فیصلے کرے گی۔ مولانا نے اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کے نظائر پیش کئے ہیں جو مختلف امور ومعاملات میں غور وفکر کرنے اور مسائل میں کھل کر اپنی رائے ظاہر کرنے کی طرف غماز ہیں۔

بہرحال یہ کتاب سابقہ کتابوں کی طرح موجودہ دور کی ایک اہم ضرورت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اور اس کی افادیت بھی اسی طرح مسلم ہے جس طرح گذشتہ کتابوں کی۔ اس کتاب کی ترتیب اور مسائل کے استدلال اور احکام شریعت کے استنباط ہیں مولانا نے جو خون جگر صرف کیا ہے مولانائے مرحوم اس کے لیے پوری امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں فجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین خیرا.

۶- عروج وزوال کاالٰہی نظام:

نظام کائنات میں قوموں کے عروج وزوال کا مسئلہ ہمیشہ سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ رہا ہے تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانہ میں مختلف قومیں اور تہذیبیں آسمان ترقی پر پہونچیں اور پھر چند دنوں کے اس باغ وبہار زندگی کا مزہ لینے کے بعد رو بہ زوال ہوگئیں۔ بابل ونینوا کی بستیوں کو آباد کرنے والی قومیں عاد وثمود، فراعنہ ونمارده اور روم وایران وغیرہ کی قومیں اور ان کا انجام ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور دور کیوں جایئے عروج وزوال کے باب میں ہمارے مسلم قوم کی تاریخ بھی کچھ کم عبرتناک نہیں ہے یہ قوم اپنے عروج کے زمانہ میں طوفانوں کی طرح اٹھی اور بجلیوں کی طرح چمکی اور فتح مندی اور کامرانی کے عظیم الشان ریکارڈ قائم کئے۔ صرف سو سال کے اندر اس نے مشرق میں سندھ، چین، ترکستان اور مغرب میں یورپ کے وسیع ترین علاقہ پر جھنڈے گاڑے اور ہسپانیہ کو اپنے اقتدار میں لے لیا علوم وفنون کی بات کی جائے تو اس قوم نے پوری دنیا پر اپنی فوقیت و برتری ثابت کردی یورپ میں قلعۃ الحمراء، قصرالزہراء اور ایشیا میں قلعہ شاہجہاں اور تاج محل آج بھی اس کی عظمت اور بلندی کے نشان کے طور پر ایستادہ ہیں۔ لیکن پھر اخلاقی اور مادی ہر اعتبار سے اس سپر پاور کو بھی زوال آکر رہا اور پرانی دنیا کے تینوں براعظموں (یورپ، افریقہ اور ایشیا) پر اپنی ترقی کی کمندیں ڈالنے والی قوم اس طرح رو بزوال ہوئی کہ اس کے بازو شل اور دماغ منجمد ہوگئے جہاد واجتہاد کی روح اس سے چھن گئی اور وطن میں بے وطنی اور غریب الوطنی کی زندگی گزارنے پر یہ مجبور ہوگئی۔ آخر اس کی وجوہات کیا تھیں اور کن اسباب وعلل کی بنا پر یہ قومیں عروج وزوال سے دو چار ہوئیں؟ کیا قوموں کا یہ عروج وزوال محض بخت واتفاق کا نتیجہ ہے یا اس کے پس پشت کچھ قوانین واسباب بھی کارفرما ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال تاریخ انسانیت کا ایک اہم سوال ہے اور ہر دور میں فلسفیوں اور مفکروں نے اس اہم سوال کا جواب ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے لیکن شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس کا صحیح جواب

8417

یہ فلسفی اور مفکرین تلاش نہ کر سکے۔ کیوں کہ اس سوال کا جواب صرف اس رب العالمین ہی کے پاس ہے جو اس کائنات کا رب ہے اور جس نے اس کی تخلیق کی ہے۔ یہ مسئلہ قرآن مجید کے بحر بیکراں کی غواصی اور اس کے علم وحکمت کے خزانوں کی تلاش کے بعد ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ جدید فلسفہ ہمیں یہ تو بتاتا ہے کہ یہ دنیا علت ومعلوم اور سبب ومسبب کی دنیا ہے اور کوئی بھی چیز یہاں اتفاقاً اور بلا سبب نہیں ہوتی۔ مگر وہ اسباب وعلل کیا ہیں اس کی تفصیل ہمیں کہیں اور نہیں ملتی۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو تاریخ اقوام کا تذکرہ کر کے قوموں کی اجتماعی صورت حال، عقائد اخلاقیات اور بناؤ بگاڑ کے اسباب کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے اور ایک ایک سبب پر انگلی رکھ رکھ کر یہ بتاتا ہے کہ یہ ہیں وہ اسباب جو تمہارے لیے عروج وارتقاء کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں ورنہ بصورت دیگر زوال اور شومئی قسمت تمہارا مقدر بن کر رہے گی۔ قرآن مجید عروج وزوال کے اس قانون کو لفظ ''سنته الله'' سے تعبیر کرتا ہے وہ کہتا ہے۔

سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا (الاحزاب۔٦٢)

یہ اللہ کی سنت ہی ہے ان لوگوں میں جو پہلے گذر چکے ہیں اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ مزید ارشاد ہے:

ان الله لا یغیر مابقوم حتیٰ یغیر وا مابانفسهم (الرعد۔۱۱)

بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل لیں اور ایک جگہ ارشاد ہے

ذلک بان الله لم یک مغیرا نعمة انعمها علیٰ قوم حتیٰ یغیر و اما بانفسهم (الانفال۔۵۳)

ایسا اس وجہ سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو عطا کرتا ہے اسے وہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کسی قوم کے افراد ان چیزوں کو نہ بدلیں جو ان کے انفس کے ساتھ وابستہ ہیں۔

مولانا کی یہ کتاب دراصل اسی اہم مسئلہ کا تفصیلی اور تنقیحی جائزہ ہے ۱۸۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک مقدمہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ دراصل اس کتاب کی تمہید ہے جس میں مسئلہ کی نوعیت اور اہمیت بیان کی گئی ہے اور کتاب میں جس انداز سے اس پر کلام کیا گیا اس کی تفصیل بیان کی ہے اور معاونین ومساھمین کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

باب اول میں انسان کے مسئلہ پر کلام کیا گیا ہے جو اس طرح ہیں انسان کا مقام ومرتبہ، خلیفہ فی الارض کی حیثیت اور اس مقام ومرتبہ کے معیار پر پورا اترنے کے لیے سیرت وکردار کا وہ پیمانہ اپنانے کی ہدایت جس کے بغیر اس دنیا کا انتظام وانصرام ممکن نہیں ہے۔

دوسرا باب ''زندگی کے نفسیاتی موثرات کے عنوان سے ہے۔ اس میں فطرت انسان کی تشریح قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ اور ان کے سوثرات، وہ خاص صلاحیتیں جو توراث وتناسل کے ذریعہ انسان میں منتقل ہوتی ہیں۔ تربیت کے مقاصد اور انسان کے جسمانی اور ذہنی ساخت اور اس کے امتیاز وغیرہ مسائل پر کلام کیا گیا ہے۔

تیسرا باب قائدین کے تربیت واوصاف اور خصائص سے متعلق ہے۔ قائدین کی تربیت کیسے ہو۔ ان کی قیادت ورہنمائی میں کون کون سے عوامل کارفرما ہونے چاہئیں۔ قرآن میں موجود جو قایدین کے اوصاف ہیں مثلاً حکمت، تاویل الاحادیث یعنی بات کی گہرائی تک پہونچنے کی صلاحیت، علم وجسم کی غیر معمولی صلاحیتیں، نظریۂ حیات سے عشق وغیرہ۔

چوتھا باب جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اس کا موضوع ہے عروج زوال کی زمین اور اس کی بنیاد اس میں بتایا گیا ہے کہ عروج وزوال کی تخم ریزی سب سے پہلے نفس انسانی میں ہوتی ہے اور اس کی بنیاد مضبوط اخلاق وکردار ہے پھر اخلاق کی عالمگیریت اور تاریخ سے اس کے ثبوت پیش کئے ہیں۔

پانچویں باب میں بقاء اصلح کے نظریہ پر کلام کیا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم کی نظر میں اصلح بننے کی کیا شرط ہے اور اس میں شرط عدالت کا خاص تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا

لایجر منکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھوا قرب للتقویٰ (المائدہ۔۸)

چھٹے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اصلح قوم کی تنظیم وتربیت کے بنیادی اصول کیا ہوں اس سلسلہ میں سورۂ عصر میں بیان کردہ چاروں بنیادی صفات کی تشریح کی گئی ہے یعنی ایمان، عمل صالح، بالحق اور تواصی بالصبر۔

ساتویں اور آخری باب میں مضمون کے دوسرے پہلو یعنی قوموں کے زوال پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے وہ کون کون سی صفات ہیں جو اگر کسی قوم میں پیدا ہو جائیں تو اس کے زوال کے لیے بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں شرک ونفاق، نظم ومرکزیت اور جذبہ اطاعت کا فقدان، محنت سے جی چرانا، اجتماعی مفاد کے مقابلے میں ذاتی مفاد کی اہمیت مذہب کی نمائش ناجائز طریقوں سے دولت کا حصول قوت اجتہاد کا خاتمہ، بے عملی اور بدعملی میں گرفتار ہونا، یاس وقنوط کے جذبات کا در آنا، توکل اور تقدیر کا غلط مفہوم، دین اور دنیا کی مذہبی تقسیم، عیش پرستی کی ذہنیت کا فروغ، قوموں کی ذہنیت میں عجوبہ پرستی اور بدعات وخرافات کی کثرت اور اس کو وجہ ارتقاء سمجھنا۔ یہ ساری علامات دراصل کسی قوم کے زوال اور اس کے قعر مذمت میں گرنے کے اسباب ہوا کرتی ہیں اور جس قوم میں جس حد تک یہ برائیاں پائی جائیں گی وہ قوم اسی قدر قدرت کے نظام زوال سے ہمکنار ہو گی۔[۱۶]

غرض یہ کتاب عروج وزوال کے الٰہی نظام کا ایک تحقیقی جائزہ ہے جس میں مولانا مرحوم نے قرآن کریم کے خزانۂ علم وحکمت سے لعل وگہر ڈھونڈھ نکالے ہیں جو بنی نوع انسانیت کی تہذیب کا اصل تمغہ ہے اس میں مولانا نے انسان کی نفسیات کے بھی ایسے بہت سے پہلوؤں پر کلام کیا ہے جو عام طور پر فہم وحواس کی گرفت سے باہر ہوتی ہیں اور اس کی لطافت ونزاکت کی وجہ سے اس کی تفہیم

آساں نہیں ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ جیسے اہل علم بزرگ مولانا کی بڑی قدر افزائی فرماتے تھے۔

مولانا نے یہ کتاب لکھ کر دنیائے انسانیت کو قرآن مجید کے ایک اہم پیغام سے روشناس کرایا اور وہ اس کے لیے تمام دنیا کی طرف سے شکریہ اور توصیف کے مستحق ہیں۔

۷- لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر:

انسانی تاریخ مذہب کے اثرات سے کبھی خالی نہیں رہی، اس کا اور انسان کا چولی دامن کا رشتہ رہا ہے مگر اسے بدقسمتی ہی کہا جائے کہ عالم انسانیت پر سیاست کے تفوق اور بالادستی کی وجہ سے مذہب ہمیشہ سیاست کا تابع فرمان بن کر رہا اور اسی وجہ سے اس کے اندر سے وہ خوبیاں آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں جو مذہب کا اصل جوہر تھیں اور جن کے بغیر مذہب کو بقاء کا کوئی استحقاق نہ تھا۔ پھر مذہب کو سیاست کا تابع بن جانے کی وجہ سے عالم انسانیت کو اس قدر نقصان اٹھانا پڑا کہ اس کی صدیوں کی تاریخ جہالت وضلالت میں ڈوب کر رہ گئی۔

یہ کتاب ہمیں تاریخ کے اسی دور سے واقف کراتی ہے نیز یہ واضح کرتی ہے کہ وہ جسے مذہب بتا کر دقیانوسیت اور جہالت فروغ دیا گیا اور جس کی وجہ سے لوگوں کے دل مذہب سے اچاٹ ہو گئے وہ دراصل مذہب تھا ہی نہیں بلکہ کچھ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ذاتی مفادات تھے۔ جنھیں حاصل کرنے کے لیے انھوں نے سیاست کی قوت سے پاپاؤں اور پادریوں کے ذریعہ مذہب کا ہوّا بیٹھا کر لوگوں کو مرعوب کیا تھا اور ان کی عزت وآزادی ان سے چھین لی تھی۔ کتنا بھیانک اور دلدوز منظر رہا ہوگا جب گلیلو جیسے سائنسداں کو جو حرکت ارض کا نظریہ رکھتا تھا کلیسا میں پادریوں کے روبرو بٹھا کر یہ عہد لیا گیا ہوگا۔ خود گلیلو کے الفاظ میں:

''میں کہ گلیلو سترویں سال کی عمر میں بحیثیت ایک قیدی تقدس مآب کے روبرو دوزانو ہوتا ہوں اور مقدس انجیل کو اپنے گلے سے لگاتا ہوں اور حرکت ارض کی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں اور الحاد کو

نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور لعنت کرتا ہوں‘‘۔ ۱۷

اور اس ستر سال کے بوڑھے کو اتنی لجاجت اور ضمیر کشانہ اعتراف کے باوجود اس کی جان نہ بخشی گئی اور مقدس محکمۂ احتساب نے زندگی بھر کے لیے اسے جلاوطن کردیا۔ یہی حال وینی نی، ہیپاشیہ، کوپرنیکس اور برونو جیسے فلسفیوں اور سائنسدانوں کا کیا گیا۔ اور مختلف النوع سزاؤں کے ذریعہ انھیں ذلیل وخوار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ میں بطور تمہید موضوع کی اہمیت، سیاست و مذہب کی آویزش، کتاب میں مندرج ابواب کی ماہیت اور طریق استدلال پر گفتگو کی گئی ہے۔

پہلا باب تاثیرات اور خصائص پر مشتمل ہے جن سے تحریف شدہ مذاہب کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے یہ خصوصیات قرآن کریم کی واضح آیات کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اور نہایت تفصیل کے ساتھ انھیں بیان کیا گیا ہے پائمال شدہ مذہب کے اثرات پچاس شقوں میں بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض اہم شقیں مندرجہ ذیل ہیں۔

اس طرح کے مذہب میں اصول ونظریات پر عزم ویقین کی روح باقی نہیں ہیں رہتی، زندگی میں نظم و مرکزیت اور اتحاد و اتفاق کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اللہ پر اعتماد باقی نہیں رہتا، دل میں نفاق سرایت کر جاتا ہے عافیت کوشی، مصلحت پسندی، سخن پروری اور حیلہ سازی آدمی کا شیوہ بن جاتی ہے، اجتماعی اغراض ومقاصد کی جگہ انفرادی اغراض ومقاصد کی اہمیت ہو جاتی ہے۔ اخلاص، صداقت اور ایمان ویقین کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اور نمائش دین اور فروعی معاملات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ فرقہ بندی شروع ہو جاتی ہے اور تعمیری کاموں کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ کذب گوئی، وعدہ خلافی اور دوسری صفات رذیلہ کے جذبات پنپتے ہیں۔ اللہ سے زیادہ انسانوں کا خوف ہوتا ہے۔ اور حق کے پرستاروں کو ذلیل سمجھا جانے لگتا ہے قوم میں یاس وقنوط کا عالم ہوتا ہے محنت

سے جی چرایا جاتا ہے اور کھلی ترقی کی راہوں کو اپنانے کی ہمت نہیں ہو پاتی ہجرت، جہاد اور نصرت کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ قلت و کثرت کی بحث چھڑ جاتی ہے اور علماء حق فروش بن جاتے ہیں ۔ مذہب کے اصول و نظریات پسِ پشت چلے جاتے ہیں اور چند فروعی اور فرسودہ مسائل کا سہارا لے کر مذہب کو ذریعۂ معاش بنالیا جاتا ہے۔ غرض یہ اور اس طرح کے بہت سارے اثرات ہیں جو اس دور میں اہل مذہب میں پیدا ہو جاتے ہیں جن کی شاہد یورپ کی پوری تاریخ ہے جو مولانا کے بیان کے مطابق ۴۸۶ء تا ۱۴۹۵ء تک تقریباً ایک ہزار سال پر محیط ہے۔

دوسرے باب میں تحریک نشاۃ ثانیہ کا بیان ہے جس میں یورپ نے مذہب کے اس کھوکھلے اور بوسیدہ لباس کو اتار پھینکا یہ دور تقریباً چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر سولہویں صدی تک کو محیط ہے اور عزت و آزادی کی یہ روح زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں کی مرہون منت ہے جسے یورپ نے صلیبی جنگوں اور اندلس وغیرہ کے علمی مراکز سے حاصل کئے تھے۔ چنانچہ جان ڈیون پورٹ لکھتا ہے۔

(ا) تمام علوم مثلاً طبعیات، نجوم، فلسفہ، اور ریاضی وغیرہ جو چودھویں صدی عیسوی سے یورپ میں رائج ہوئے وہ سب کے سب عربی مدارس سے ماخوذ ہیں اسی بنا پر ہسپانیہ کو یورپی فلسفہ کا موجد تسلیم کرنا چاہیے۔ [۱۸]

اس باب میں مولانا نے یورپ کی ان اہم تحریکات اور شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اس تحریک نشاۃٔ ثانیہ میں اہم رول ادا کیا اور قدیم علوم وفنون کو زندہ کرنے اور مذہب کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں جان وکلف (Johnwicliffe) ایرسمس (Earsmus) اور مارٹن لوتھر (Martih luther) وغیرہ کی شخصیات کافی اہم ہیں ان تحریکات کی وجہ سے کلیسائی نظام میں بعض اصلاحات تو ضرور ہوئیں لیکن مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ خونریزی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہر دونوں فرقے حسب موقع ایک دوسرے کا خون بہانے سے نہ چوکتے۔ لیکن بہرحال یورپ کے عروج وارتقاء میں ان تحریکات کی مساہمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لوتھر کی تحریک کے علاوہ جن دوسری اصلاحی تحریکات نے رول ادا کیا وہ یہ ہیں۔

(۱) زوینگلی تحریک Zwingli Movement

(۲) کیلونی تحریکات Caluni Movments

(۳) رومن کیتھولک تحریک جسے اصلاح معکوس کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

(۴) اور یسوعی سلسلہ کا قیام وغیرہ

اس نشاۃٔ ثانیہ کے نتیجہ میں یورپ میں ذہنی وفکری سطح پر جو انقلاب آیا اور جو بالآخر اس کی علمی اور سائنس تفوق پر منتج ہوا اس کے اثرات یہ تھے۔

ذہن وفکر میں وسعت دنیا کے عیش وعشرت حاصل کرنے کا جذبہ،فنون لطیفہ کی دنیا میں انقلاب ، نظام جاگیرداری ختم کرکے جدید انداز معاشرت شروع کرنے کا جذبہ، عالم فطرت کا مطالعہ، زمانۂ قدیم کے علمی ذخیروں کی تلاش ،صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت کی تشکیل جدید، چھاپہ خانہ اور جدید آلات حرب وضرب بالخصوص بارود کی ایجاد، بحری اسفار اور نوآبادیات کا قیام وغیرہ۔

اس کے بعد تیسرا باب شروع ہوتا ہے جو’’ جدید دور کے مخصوص حالات‘‘ کے نام سے موسوم ہے اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جدید یورپ کے فروغ میں مذہبی ذہنیت کو کوئی قوت حاصل نہ تھی بلکہ کلیسا کے نظام کے خلاف بغاوت پر اس کی بنیاد رکھی گئی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ناقص یا کامل نظام بغیر اپنے مستقل فلسفہ کے زندہ نہیں رہ سکتا اس لیے اس نشاۃٔ ثانیہ کو اپنے تحفظات کا بندوبست کرنا تھا۔ چنانچہ اس نظام کو سہارا دینے کے لیے جو فلسفہ وجودِ میں آیا وہ کلیۃً الحاد اور بے دینی پر مبنی تھا۔مگر یہ یورپ کی بڑی بدقسمتی تھی کہ اس مرحلہ میں اسے اس مذہب حقیقی سے واسطہ ہی نہیں پیش آیا جو انسان کی فطرت کی نمائندگی کرتا ہے۔اور جو ترقی وتقدم کا نہ صرف حامی ہے بلکہ اس کا رہنما بھی ہے اور جو انسان کے فکر وضمیر اور حریت وآزادی کا محافظ بھی ہے میری مراد دین اسلام سے ہے۔اور اسی رہنمائی کے نہ ملنے کی وجہ سے یورپ کا پورا فلسفہ اور

نظام لا مذہبیت بلکہ مذہب سے تنفر و عناد سے بھرا ہوا ہے اور اس فلسفہ کے بطن سے ایسے ایسے زہریلے ناگ اور عفونت زدہ کیڑے نکلے ہیں جنھوں نے پوری انسانیت کو ڈس لیا ہے۔ اسی لیے ہم یورپ کی عروج و ترقی کے مداح ہونے کے باوجود اس کے ان ثمرات خبیثہ کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے جو عالم انسانیت کے لیے سوہان روح بن گئے ہیں۔ یورپ کے ان فاسد نظریات میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) **نظریہ قومیت**:- اس کا انتساب اگرچہ میکاولی(Machiay elli) کی طرف کیا جاتا ہے مگر دراصل اس کی جڑیں رومی تصور سیاست سے مستنبط ہیں جنھیں میکاویلی ماکیاول نے اپنی تشریحات کے ساتھ برآمد کیا تھا اس لیے اس کا انتساب اسی کی طرف کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے اپنی قوم کا مفاد ہر لحاظ سے مقدم تر ہے۔ اور اس مقصد کے آڑے آنے والے مذہب، اخلاق اور قانون کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ حالانکہ بذات خود نا تو اس نظریہ میں کوئی کشش اور جمال موجود تھا اور نا ہی نظریہ ساز میں مگر اتفاق سے حالات کی سازگاری کی بنا پر اس نظریہ کو قوت و اقتدار حاصل ہوا۔ اور قوت و اقتدار کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے جلو میں رعنائیوں اور دلفریبوں کو تو سمیٹ لیتے ہیں مگر خامیوں اور کمزوریوں کو چھپا لیتے ہیں۔

(۲) **فطری مذہب**:- اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان تمام خارجی رسوم و روایات سے آزاد ہے اور محض فطرت انسانی پر مبنی قوانین کا پابند ہے۔

اس نظریہ کی تائید کرنے والوں بوڈن(Bodin) ہربرٹ(Herbert) اور ٹورالبا (Toralaba)وغیرہ فلسفیوں کا اہم رول رہا ہے۔

اس نظریہ کے مطابق مذاہب وحی الٰہی کے حدود و قیود کے محتاج نہیں ہیں بلکہ صرف مجہول فطرت اور آزاد عقل ہی انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

یہ باب خالص فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل ہے جس میں یورپ کے تقریباً تمام اہم فلسفیوں

کے اقوال ونظریات پر گفتگو کر کے ان کے نقائص کو واضح کیا گیا ہے۔

چوتھا اور آخری باب لا مذہبی دور کے چند اہم نظریات پر مشتمل ہے جن کا اس دور میں بڑا اثر رہا اور آج بھی کہیں نہ کہیں اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مولانا کا خیال یہ ہے کہ یہ دور تقریباً انیسویں صدی سے شروع ہو کر اس وقت تک محیط ہے جب تک موجودہ دجالی سیاست برقرار رہے گی۔ یہ نظریات چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء میکڈوگل کے نظریہ جبلت سگمنڈ فرائڈ کے نظریہ جنسیت اور کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت پر مبنی ہیں جن کا خلاصہ مولانا کے الفاظ میں یہ ہے۔ان نظریات کے بدولت

(۱) انسان نورانی الاصل کی جگہ حیوانی النسل قرار پایا۔

(۲) فطرت انسانی کی لطافت کو نظریہ جبلت کی کثافت میں تبدیل کر دیا گیا۔

(۳) عفت وعصمت کے جذبہ کو نظریہ جنسیت کی ہوسنا کی میں تبدیل کر دیا گیا۔

(۴) انسان کے روحانی آبگینہ کو نظریہ اشتراکیت کی قساوت سے پاش پاش کر دیا گیا۔

مولانا کا پیغام ہے کہ ایسی حالت میں مذہبی مفکرین کا فرض ہے کہ وہ حقیقی مذہب کی نشاۃ ثانیہ کی فکر کریں اور اس کے حدود و قیود متعین کر کے جذبات کی ماری ہوئی دنیا کو مذہبی عدل واعتدال کی دعوت دیں۔

۸- اجتہاد کا تاریخی پس منظر:

''اجتہاد کا تاریخی پس منظر'' مولانا تقی امینی مرحوم کی ایک اور قابل قدر تالیف ہے۔آج کل احکام ومسائل اور فقہی جزئیات پر نظر رکھنے والے اصحاب فکر ونظر کی کمی نہیں ہے لیکن ایسے لوگ خال خال ہی ملیں گے جو قدیم فقہی کتابوں میں مذکور مسائل سے آگے بڑھ کر اور پیش آمدہ مسائل میں نصوص کتاب وسنت، اجماع اور دیگر اصولوں کی روشنی میں پھیل کر سوچ سکیں اور اجتہاد وتفقہ کے ذریعہ مسائل کو حل کر سکیں۔ مولانا امینی مرحوم کا شمار علماء کے اسی طبقہ میں ہوتا ہے جو اسلامی فقہ کے

جمود و تعطل کو ختم کر کے اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا چاہتا تھا۔ مولانا کو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات اور شرعی اصولوں کی نزاکتوں کا پورا احساس تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان کا سامنا ایسے ٹھیٹ مذہبی حلقہ سے تھا جو کسی قسم کے ردو بدل اور غور وفکر کے قائل نہ تھے اور دوسری طرف جدید تہذیب سے مرعوب ایسے افراد بھی تھے جو شریعت کے ہر اصول وضابطہ کو جدید معیار پر لانے کے لیے اصولوں اور بنیادوں تک میں ہر قسم کے کی کتر بیونت کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مولانا نے ہر دو طبقہ کو اپنی گفتگو کا محور بنایا اور انھیں اجتہاد کے نشیب وفراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا اور فکر واجتہاد اور تفریع واستنباط کو امت مسلمہ کا جوہر بتایا جس کے بغیر امت کے خرافات میں کھو جانے کا اندیشہ تھا۔

مولانا کی یہ کتاب فکر ونظر اور شرعی اجتہاد، استنباط اور استدلال کے مسئلہ پر ایک قابل غور تحریر ہے اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا انگریزی ترجمہ پاکستان سے Fundamentals of Ijtihad کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو اہم ابواب پر مشتمل ہے۔

مقدمہ میں مسئلہ اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ ایک مشکل فن ہے جس کی وجہ سے اہل علم اس فن سے کنارہ کش ہو چکے ہیں اور ارباب دانش محض تفنن طبع اور تبدیلی ذائقہ کے لیے سیمینار وغیرہ کرتے رہتے ہیں مولانا نے اس مسئلہ کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اولاً قیام اجمیر کے دوران ۱۹۶۲ء میں ہی ''مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر،، لکھی تھی جس میں اجتہاد سے متعلق ضروری تفصیلات کے علاوہ بعض نئے گوشوں کی بھی نشاندہی کی تھی جن میں جدید دور کی رہنمائی کے لیے اجتہاد کی ضرورت واضح کی گئی تھی اور واضح کیا گیا تھا کہ فقہ کی تدوین جدید کے لیے اجتہاد کے بغیر چارہ نہیں اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں مولانا نے زیر تبصرہ کتاب ''اجتہاد کا تاریخی پس منظر،، لکھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین عظام اور فقہا کا منظم کردار اجتہاد کے باب میں واضح کیا گیا ہے نیز اجتہاد کی ضابطہ بندی کے ساتھ اس کے منتشر اور الجھے ہوئے اصول ایک لڑی کی صورت میں پیش کئے گئے۔ اس کے بعد

پہلا باب ہے جو ''اجتہاد کی حقیقت'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں اجتہاد کی تعریف وتعارف کے بعد قرآن کریم اور احادیث صحیحہ سے اجتہاد کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ خود نبی کریمؐ نے کھولا پھر مولانا نے اپنی مخصوص اصطلاح ''شعور نبوت'' کا تعارف کراتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجتہاد کی نوعیت واضح کرانے کے لیے علامہ سرخسیؒ کہ رائے نقل کی ہے۔

امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:

واصح الا قاویل عندنا انه علیه السلام فیما کان یبتلیٰ به من الحوادث التی لیس فیها وحی منزل. کان ینتظر الوحی الیٰ أن تمضی هدّة الا نتظار ثم کان یعمل بالرأی والاجتهاد دو بین الحکم به فاذا اقر علیه کان ذلک حجة قاطعة للحکم'' ١٩

شعور اجتہاد کی تعریف مولانا کے لفظوں میں یہ ہے:

ایسا ملکہ جس کے ذریعہ اصل سے فرع کا شرعی استنباط کرنے پر قدرت حاصل ہو۔ ٢٠

مولانا کے نزدیک اجتہاد کا وجود تین شکلوں میں ہوتا ہے۔ اجتہاد توضیحی، اجتہاد استنباطی اور اجتہاد اصلاحی، مولانا فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فقہ میں جس قدر بھی ترقی ہوئی اور مسائل میں اجتہاد کئے گئے سب انہیں تینوں شکلوں کے مرہون منت ہیں۔

اس کے بعد دوسرا باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے اجتہاد کا تدریجی ارتقاء یہ بات قدرے طویل اور کئی فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں اجتہاد کی مذکورہ تینوں شکلوں کی تفصیل مثالوں کے ذریعہ پیش کی گئی ہے۔ یہ فصل صحابہؓ کرام کے اجتہاد کے لیے خاص ہے۔ دوسری فصلد ور ثانی یعنی تابعین کے اجتہاد کے لیے خاص ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ تابعین کے بنیادی کارنامے کیا ہیں۔ مثلاً احادیث کی تدوین، اجتہاد کی شیرازبندی، اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے زاویۂ نگاہ کا تعین اور

اجماع وغیرہ کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسری فصل میں دور ثالث کا تعین اور ائمہ مجتہدین کے اجتہادات اور ان کی کارگذاریوں پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ اس بات میں اجتہاد کی مذکورہ تینوں اقسام پر مفصلاً کلام اور اس کے تفصیلی احکام مرتب کئے گئے ہیں اور نص کے الفاظ سے استدلال کی تین شکلوں کی وضاحت عبارۃ النص، اشارۃ النص اور اقتضاء النص کے نام سے، کی گئی ہے۔ اور چونکہ اس باب میں قواعد اور اصول پر گفتگو کی گئی ہے اس لیے ائمہ اربعہ کے اختلافات کی نوعیت اور اتفاق کی شکلوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور معرفۃ النص سے متعلق اصول وضوابط اور قواعد وقوانین بنائے گئے ہیں۔ خاص وعام، مخصص، تاویل وتفسیر، مجمل ومفصل محکمہ اور متشابہ حقیقت ومجاز، امر ونہی اور مکروہات وغیرہ کی مختلف شکلوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

دوسری فصل اجتہاد استنباطی کے سلسلہ میں ہے اس فصل میں قیاس لغوی اور اصطلاحی کی تعریف کے علاوہ قیاس کے ارکان یعنی اصل، فرع، حکم اور علت پر گفتگو ہے پھر چونکہ علت کی اصول فقہ میں بڑی تفصیل ہے اس لیے علت کی تین بنیادی اصطلاحات تنقیح مناط، تخریج اور تحقیق مناط کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔ اور ان مناطات کو مثالوں اور دلایل سے واضح کیا گیا ہے۔ اسی طرح اجتہاد استنباطی کے ضمن میں استحسان اور استصحاب جو اصول فقہ کی دو بنیادی اصطلاحات ہیں اور قیاس کے قبیل کی چیزیں ہیں اس لیے اولاً استحان کی ضرورت پھر قبولیت استحسان کی چار شکلیں بیان کی گئی ہیں۔

پھر قیاس پر دوسرے حکم کو ترجیح دینے کی مختلف شکلیں بیان کی گئی ہیں جیسے یہ کہ سند منصوص ہو یا معروف ہو یا ضرورت ہو یا مخفی ہو۔ اس کے بعد مولانا نے مسئلہ استحسان میں امام شافعیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اختلافات اور اس کے وجوہ واسباب بیان کئے ہیں پھر اسی ضمن میں مسئلہ استصحاب کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ اس کی تعریف اس کی شکلیں اور اس سے متعلق مباحث کا تذکرہ دلیلوں اور مثالوں سے کیا ہے اور خاص ملکی وملی معاملات اور جدید مسائل میں اس کی اہمیت واضح کی ہے۔

تیسری فصل اجتہاد استصلاحی سے متعلق ہے۔ اس میں سب سے پہلے استصلاح کی لغوی اور اصطلاحی تعریف پھر مصالح وضروریات کے وقت استصلاح کی اہمیت، اجتہاد استنباطی اور استصلاحی میں فرق، مصالح مرسلہ کی فقہی تعریف اور اس کے اصول وضوابط، اجتہاد استصلاحی کو منضبط کرنے کے قواعد وضوابط جس میں بنیادی حیثیت جلب مصلحت اور دفع مفاسد کو حاصل ہے اور اس تعلق سے صحابہ وتابعین اور فقہائے اربعہ نے مسائل کا جو استخراج کیا ہے اور اس میں توسع کی جو شکلیں نکالی ہیں ان کا بھی تذکرہ ہے اور بعض ائمہ نے اس مسئلہ میں جو اختلاف کیا ہے اسے ذکر کر کے توافق کی شکلیں بیان کی ہیں نیز یہ بھی بتایا ہے کہ مصالح مرسلہ اور نصوص شرعیہ میں ٹکراؤ کے وقت کیا شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اس طرح فتح ذرائع اور سد ذرائع جو شریعت اسلامیہ کی عظیم مصلحتیں ہیں ان کا نفاذ کب اور کن حالات میں ہوگا ذرائع کی کتنی قسمیں ہیں۔ کیا تفسیر احکام میں تغیر زمان کا دخل ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اور چونکہ یہ بہت اہم مسئلہ ہے اور مولانا کا رجحان اثبات کی طرف ہے اس لیے مولانا نے اپنے موقف کے استدلال میں قرآن وسنت اور صحابۂ کرام کے فیصلوں سے اس کی مثالیں پیش کر کے اپنے موقف کو مضبوط کیا ہے۔

بہرحال مولانا کی یہ کتاب اجتہاد کے مسئلہ پر رکے ہوئے پانیوں میں پتھر مارنے کے مصداق ہے اور سوئے ہوئے گروہ علماء میں اس روح اجتہاد کے جھنجھوڑنے کے مصداق ہے جس کے بغیر اس امت کی ترقی ممکن نہیں ہے، حالانکہ خود مولانا کے ہی بقول اس علمی مسئلہ پر قلم اٹھانا کچھ بے سود سا ہے مگر ''معذرۃً الی ربکم'' کے تحت ایسا کرنا ضروری بھی تھا اور کسی نہ کسی درجہ میں یہ امید بھی کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں طوفان کی شدت قلب ودماغ کہ لہروں میں ارتعاش پیدا کردے اور چارو ناچار سفینہ کی تیاری پر مجبور ہونا پڑے۔[۲۱]

۹- فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر:

مولانا امینیؒ مرحوم کی یہ ایک اور اہم محققانہ تصنیف ہے جو نہ صرف قانون اسلامی کی وسعت

و گہرائی کا پتہ دیتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ عصر حاضر میں فقہ اسلامی کی جدید تزئین کیسے ممکن ہے۔ اس ضمن میں فقہ اسلامی کے تدریجی ارتقاء اور اس کے اصلی اور ضمنی مآخذ بالخصوص قیاس کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو نہایت عمدہ اسلوب میں واضح کیا گیا ہے۔

مولانا مرحوم اس بات کے شدت سے قائل تھے کہ فقہ اسلامی کی جدید تدوین ہونی چاہیے لیکن انھیں اس کے موقع محل اور نزاکتوں کا بھی احساس تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کام میں خاطر خواہ کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک فضا کی ناہمواریوں کا اندازہ نہ لگا لیا جائے اور پھر معاشرہ کے اندر ضبط وانگیز کی جو صلاحیت ہے اس کو سامنے رکھ کر یہ کام کیا جائے، اس کے علاوہ قانون بالخصوص مذہبی قوانین کا ایک خاص روح اور مزاج ہوتا ہے اور اس نزاکت کی رعایت کئے بغیر اس مقصد کو کبھی حاصل نہیں کیا جا سکتا جس کے لیے یہ قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ دراصل ہمار موجودہ معاشرہ مذہب کی دو قسموں یعنی حقیقی اور رواجی مذہب میں تقسیم ہو چکا ہے اور حقیقی مذہب کو اپنے قیام و بقاء کے لیے اس رواجی مذہب سے ٹکرانا لازم ہے، مگر یہ ٹکراؤ اس وقت تک فائدہ مند نہیں ہے جب تک حقیقی مذہب کے خدو خال نہ درست کر لئے جائیں۔ قانون خواہ کتنا ہی عمدہ اور بہتر ہو اگر اس کی مناسب تعلیم و تعلم اور اس کے نفاذ میں موقع و محل اور امانت و دیانت سے کام نہ لیا جائے تو قانون بذات خود بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا ہے۔ معاشرہ میں ضبط وانگیز کی صلاحیت اور قانون کی نزاکتوں کی قبولیت اور عدم قبولیت کی اہلیت کا اندازہ کیسے لگایا جائے اس کے لیے مولانا نے کچھ معیارات متعین کئے ہیں جو یہ ہیں۔

معاشرہ کے اندر ضبط وانگیز اور جدید تدوین کو قبول کرنے والا گروہ صرف ایک مختصر سا طبقہ ہے بقیہ متجددین اور بے حس لوگوں کا ایک انبوہ ہے جنھیں اس کی دقّت و نزاکت کا کوئی احساس نہیں فقہ کی جدید تدوین میں اسی پہلے گروپ کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا ہوگا اور اگر بدقسمتی سے ایسا نہ کیا گیا تو یہ طبقہ متجددین کے دام تزویر پھنس کر اپنے کو اسلام کی خود ساختہ تعبیر کے حوالے

کردے گا۔

فقہ کی تدوین جدید کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ مذہبی قوانین کا مجموعہ ہے۔ جس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس کی بنیاد عظمت وتقدس پر قائم ہے جب کہ دنیا کے کسی بھی قانون کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ فقہ کی تدوین جدید کے وقت ہمیں اس پہلو کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ تدوین جدید کی کوئی آواز قابل قبول نہ ہوسکے گی۔

پھر اس تدوین جدید میں احتیاط کا پہلو بھی ملحوظ رکھنا سخت ضروری ہے یعنی انسانی زندگی کا جو پہلو عبادات سے متعلق ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی قوم متحمل نہیں ہوسکتی البتہ وہ پہلو جو سیاسیات یا معاملات سے متعلق ہیں اس میں بھی کافی غور وفکر کی ضرورت ہے اور ان مسائل کو تو ہاتھ لگانا مہلک ہی ہوگا جو خود حالات کے دستبرد سے از خود قصہ ماضی بن چکے ہیں۔

اس طرح تدوین جدید کے مسئلہ میں اس میں اس بات کی بھی بالکل کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ تمام مذاہب فقہ کو ملا کر ایک ملی جلی فقہ تیار کرلیں۔ یہ بھی سخت مضر ہوگا اولاً اس لیے کہ فقہی اختلافات بذات خود رحمت ہیں اور یہ تنوع بشرطیکہ وہ مسائل قرآن وحدیث ہی کے کس جزئیہ سے مستنبط ہوں امت مسلمہ کے توسع ذہنی کا پتہ دیتی ہیں ثانیاً اس لیے بھی کہ امت مسلمہ اس کام کے لیے ذہنی طور پر کبھی تیار نہ ہوسکے گی۔ اس لیے موزون صورت یہی ہے کہ جس ملک میں جو فقہ رائج ہو اسے سامنے رکھ کر جدید تدوین کام کیا جائے البتہ جن مسائل میں حالات وتقاضاہ کے مطابق تبدیلی کرنی پڑے یا نئے مسائل حل کرنے کی ضرورت ہو تو ایسے مواقع پر دوسری فقہ نیز اختلاف فقہاء سے ضرور مدد لی جائے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کام کی اور کوئی آسان شکل نہیں۔

ان معیارات کے علاوہ فقہ کی تدوین جدید میں جن چیزوں سے مدد لی جاسکتی ہے وہ یہ ہیں اجماع کو متحرک اور فعال بنانے کی ضرورت پھر اجتہاد کے بند دروازے کی قفل کشائی۔ اصول فقہ کی قدیم کتابوں میں مندرج اصول وقواعد سے رہنمائی کا حصول وغیرہ۔

اس اصولی مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو چھ اہم ابواب پر مشتمل ہے باب اول کا عنوان ہے فقہ کی حقیقت اور مفہوم میں بتدریج تنگی، اس بات میں سب سے پہلے لفظ فقہ کی تحقیق اور فقیہ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ پھر محدث اور فقیہ میں فرق اور ان کے کاموں کی نوعیت کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر قرآن کریم اور سنت نبویہ سے فقہ کی اہمیت اور اس کے امتیازات بیان کئے گئے ہیں فقہ اور حکمت کا باہمی ربط وتعلق ان کے درجے اور مراتب نیز صدر اول میں فقہ کا انطباق کتنا وسیع تھا اور بعد کے مراحل ہیں اس کے مفہوم میں تنگی آنے کی وجوہات کیا ہیں اور یہ تنگی فقہ کی جدید تدوین میں کس طرح مشکلات کا باعث بن گئی اس کے وجوہ واسباب کا تذکرہ ہے۔اور یہیں پر باب اول ختم ہوجاتا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ہے فقہ اسلامی کا تدیجی ارتقاء مولانا کے نزدیک ترقی کے اعتبار سے فقہ اسلامی چار ادوار میں منقسم ہے اس کا پہلا دور حیات نبوی سے آپ کی وفات حسرت آیات یعنی ۱۰ھ تک دوسرا دور عہد صحابہ کا ہے جو ۴۱ھ یعنی خلافت راشدہ کے اختتام تک محیط ہے تیسرے دور کا آغاز صغار صحابہ اور کبار تابعین کے زمانہ سے شروع ہوکر دوسری صدی، ہجری کی ابتداء تک ہے اور چوتھا دور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے تقریباً نصف تک کو محیط ہے۔

پہلے دور میں جو دور نبوی کہلاتا ہے فقہ اسلامی کے دو ماخذ بیان کئے گئے ہیں ایک قرآن کریم دوسری تشریحات نبوی، اس دور میں نبی کریمؐ کے کاموں کی تفصیل مختصراً یوں تھی۔ تعلیم کتاب، تعلیم حکمت، تزکیۂ نفس، ایسی جماعت کی تیاری جو کار نبوت کو نقشہ نبوت کے مطابق انجام دے نیز اس جماعت کی ایسی عملی تربیت جو ہر طرح کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی اہلیت وصلاحیت رکھتی ہو۔

دوسرا دور چونکہ فتوحات کی کثرت اور تمدن کی وسعت کے لحاظ سے سابقہ دور سے ممتاز ہے اس لیے اس میں نئے نئے سیاسی واجتماعی مسائل بھی ابھر کر سامنے آئے اس لیے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے دو چیزوں کا اور اضافہ ہوا ایک اجماع دوسری رائے یا قیاس حالانکہ یہ دونوں

چیزیں زمانہ نبوت میں بھی موجود تھیں مگر چونکہ اس وقت وحی آسمانی کا سلسلہ قائم تھا اس لیے اس کی ضرورت شاذ و نادر ہی پڑتی تھی لیکن بعد کے مراحل میں جب وحی آسمانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو خود حضرات صحابہ کرام نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے فقہ کی توسیع کی راہیں کھولیں۔

تیسرا دور جو ۴۱ھ سے شروع ہو کر دوسری صدی ہجری کے آغاز تک جاتا ہے فقہ کا تاسیسی دور کہلاتا ہے۔ فقہ کی ترتیب و تدوین کا پورا مسالہ اسی دور میں تیار ہوا تھا اس دور کے خاص امتیازات یہ ہیں۔

۱- اس دور میں مختلف فرقے رائج ہوئے۔ بالخصوص امت مسلمہ تین گروہوں شیعہ، خوارج، اور جمہور میں تقسیم ہوئی اور چونکہ سب کے رجحانات و میلانات الگ الگ تھے اس لیے ہر گروہ اپنے اپنے آدمیوں کو ترجیح دیتا تھا۔

۲- صحابہ کرامؓ کا مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل جانا اس کے نتیجہ میں مختلف منفی اور مثبت اثرات کا مرتب ہونا۔

۳- تدوین حدیث اور وضع حدیث کا آغاز اس دور میں ہوا۔

۴- غیر عربوں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام جس کے نتیجہ میں اہل عجم سے علماء اور محدثین کی ایک بڑی جماعت کا وجود میں آنا

۵- رائے اور حدیث کے استعمال کرنے کی حد میں اختلاف اور اسی دور میں قیاس، استحسان اور استصلاح کے اصطلاحات کا استعمال کثرت سے ہونا۔

چوتھے دور کی بنیاد کا سارا مسالہ تیسرے دور میں ہی تیار ہو چکا تھا اس دور کے اہم امتیازات یہ ہیں۔

۱- تدوین حدیث کا کام اس دور میں انجام پایا نیز اس دور میں جرح و تعدیل کا فن بھی وجود میں آیا۔

۲- اصول فقہ کی تدوین اور قیاس واستحسان کو ماخذ قرار دینے میں علماء فقہ وحدیث کے درمیان اختلاف کی نمود۔

۳- شیعہ فرقہ کی امامیہ اور زیدیہ کے درمیان تقسیم عمل میں آئی۔ یہاں پر دوسرا باب ختم ہوتا ہے اور تیسرا باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ''فقہ اسلامی کے مآخذ'' اس باب میں ان مآخذ کی تفصیل دی گئی ہے جن کے ذریعہ اس دور کا مجموعہ فقہ وجود میں آیا تھا۔ مولانا کے نزدیک فقہ اسلامی کے بارہ مآخذ ہیں۔

(۱) قرآن حکیم (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس (۵) استحسان (۶) استدلال (۷) استصلاح (۸) مسلمہ شخصیتوں کی رائیں (۹) تعامل (۱۰) رسم ورواج (۱۱) ماقبل کی شریعت (۱۲) ملکی قانون اور یہ مآخذ دراصل چار بنیادوں سے متفرع ہیں یعنی قرآن وسنت اجماع اور قیاس۔

پھر ان مآخذ سے استدلال یا استنباط مسئلہ میں کن اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے ان سب کی الگ الگ تشریح کی گئی ہے مثال کے طور پر قرآن کریم کو بحیثیت مآخذ اختیار کرنے کے لیے چار اصولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اولاً عدم حرج دوم مکت قلّیت تکلیف سوم اصول تدریج چہارم اصول نسخ۔ دوسرا اصولی مآخذ سنت ثابتہ ہے اور اس سے مراد نہ صرف اقوال وافعال رسول ﷺ ہیں بلکہ دوسروں کے ذریعہ کئے ہوئے وہ کام بھی ہیں جن پر آپؐ نے سکوت فرمایا ہو۔ سنت کے اصولی مآخذ ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور اس سلسلہ میں خلفائے اربعہ اور اصحاب رسول ﷺ کا تعامل کیا رہا ہے؟ نیز امت کا اجتماعی مسلک اس سلسلہ میں کیا رہا ہے ان سب کی وضاحت کرنے کے بعد مولانا نے تدوین فقہ میں سنت کے طریقۂ استعمال میں امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ کار کی وضاحت کی ہے اور حدیث کو ماخذ بنانے کے لیے کس قسم کی احتیاطات مطلوب ہیں بطور خاص اسناد یا روایت کی جانچ پرکھ کے ساتھ درایت کا پہلو بھی کافی اہم ہے۔ ان سب چیزوں کی اصولی وضاحت مولانا نے اس مسئلہ میں کی ہے۔

تیسرا اہم اور بنیادی ماخذ اجماع ہے۔اس سلسلے میں اجماع کی تعریف، اہمیت، قرآن وحدیث سے اجماع کی اصولی مآخذ ہونے کی بنیاد اسلام میں شورائیت کی تنظیم، انعقاد اجماع کی صورتیں، نیز اجماع پر وارد ہونے والے اعتراضات کو جواب دیا گیا ہے۔

چوتھا اصولی ماخذ قیاس ہے۔اس فصل میں قیاس کی تعریف اہمیت وضرورت، قیاس پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات، صحابہ کرمؓ کے قیاس کی مثالیں، قیاس میں علّت کی بنیاد، حکمت اور علت میں فرق وغیرہ موضوعات پر اصولی بحثیں کی گئی ہیں۔

ان چاروں اصولی مآخذ کے بعد ان آٹھ مآخذ کا بھی تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ جو دراصل انھیں چاروں اصولوں سے متفرع ہیں۔

چوتھا باب فقہی اصول وکلیات سے متعلق ہے۔اس باب میں وہ عام اصول وکلیات بیان کئے گئے ہیں جن کی استنباط مسائل میں خاص ضرورت پڑتی ہے۔مثلاً یہ کہ مشقت سہولت لاتی ہے، تخفیف وسہولت کی صورتیں، حرج کا اٹھالیا جانا، انسانی زندگی میں عدل وتوازن کا اعتبار، نقصان کو دور کیا جائے، نقصان کو نقصان سے دور نہ کیا جائے، بڑے نقصان کو چھوٹے نقصان سے دور کیا جائے۔شئی اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو ضد کی طرف لوٹتی ہے، ابتدائی اور انتہائی مراحل میں بعض احکام مختلف ہوتے ہیں، کام مقاصد کے لحاظ سے دیکھے جاتے ہیں۔یقین شک سے زایل نہیں ہوتا۔اشیاء میں اصل اباحت ہے حدود شبہات سے ساقط ہو جاتے ہیں، فائدہ ضمان کے بدلے ہے۔وغیرہ وغیرہ پھر ان اصول وکلیات کے استعمال میں کن بنیادی ہدایتوں کا پاس ولحاظ رکھنا ضروری ہے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد پانچواں باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ''فقہی احکام میں تخفیف اور سہولت کے چند اسباب'' اس باب میں ان اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی وجہ سے احکام میں تخفیف واقع ہو جاتی ہے مثلاً سفر، مرض، اکراہ، نسیان، عسر اور عموم البلویٰ وغیرہ۔

چھٹا اور آخری باب اختلاف فقہا کے اسباب سے متعلق ہے اس باب میں ان اسباب وعلل کا جائزہ لیا گیا ہے جن کی وجہ سے فقہاء عظام کے درمیان اختلاف وقوع پذیر ہوئے اس کے دو بڑے سبب بیان کئے گئے ہیں۔ اولاً صحابہ وتابعین کے درمیان یا ان کے دور ہی میں اختلافات کا وقوع پذیر ہونا۔ دوم: حالات و تقاضہ کا اختلاف جس میں نئے حالات ومسایل کا حل دریافت کرنے کے لیے مختلف اصول وضع کرنا اور مقررہ اصولوں کے تحت ان کا حل دریافت کرنا۔

اسی باب میں ضمناً یہ نکتہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ محدثین اور فقہاء دونوں مقابل گروہ نہ تھے بلکہ ان دونوں کے کاموں کی نوعیت میں فرق تھا ایک کا کام مواد جمع کرنا دوسرے کا کام اس جمع شدہ مواد سے نقشہ کے مطابق تعمیر کا فریضہ انجام دینا اور ان دونوں گروہوں نے اپنا کام بخوبی انجام دیا۔ نہ کسی فقیہ کی یہ جرأت تھی کہ وہ نصوص صحیحہ کے ہوتے ہوئے اپنا اجتہاد کر سکے اور نہ کسی محدث کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ حالات وزمانہ کے تقاضوں اور ان کے مسائل کو نظر انداز کیا جا سکے۔

بہر حال مولانا مرحوم کی یہ کتاب فقہ کی تشکیل جدید اور تدوین نو میں ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور جب بھی اس کام کے لیے کوششیں کی جائیں گی مولانا مرحوم کی اس کاوش کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔

۱۰- حکمت القرآن:

قرآن مجید علم وحکمت کا خزانہ ہے یہ حکمت دراصل بشریت اور تہذیب کا اصل تمغہ ہے۔ دین کی روح اصل میں قرآنی حکمت میں پوشیدہ ہے۔ مگر یہ حکمت کیا ہے؟ دراصل اس کی تشریح بہت حساس اور نازک ہے علمائے سلف اسے اس کی تشریح میں مختلف اقوال منقول ہیں عام طور پر حکمت سے مراد احادیث نبویہ کو لیا جاتا ہے مگر مولانا کے نزدیک یہ حکمت قرآن سے الگ نہیں ہو سکتی اور ان کی دلیل مندرجہ ذیل آیات قرانیہ ہیں۔

وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ. یعنی اللہ نے آپ کے اوپر کتاب اور

حکمت اتاری۔ایک اور جگہ ارشادفرمایا:

واذکر ن یایتلیی فی بیوتکن من آیات الله والحکمة ۲۳؎

اور یاد کرو جو اللہ کی آیات سے اور حکمت تمہارے گھروں میں تلاوت کی جاتی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:

''حالانکہ کتاب کے علاوہ نہ اور کوئی چیز اتاری گئی اور نہ کسی اور چیز کے پڑھے جانے کا معمول تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکمت کتاب ہی میں شامل ہے۔خود رسول ﷺ نے قرآن کی معنویت سے سنت کی شکل میں حکمت حاصل کی جس کو سند کا درجہ حاصل ہے۔اسی طرح صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد اہل حضرات نے دونوں کی معنویت سے حکمت حاصل کر کے دین وشریعت کو زندہ جاوید بنادیا چنانچہ علامہ علاء الدین علی اپنی تفسیر جو تفسیر خازن کے نام سے معروف ہے میں لکھتے ہیں:

''فکان عمر یجتھد فی تعرف الحکمة التی نزلت فیھا الآیه و یحاول معرفة المصلحة التی جاء من اجلھا الحدیث و یا خذ بالروح لا بالحرف''

یعنی حضرت عمرؓ برابر اس حکمت کی تلاش میں سرگرداں رہتے جس میں آیت نازل ہوئی اور اس مصلحت کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتے جس کی وجہ سے حدیث وارد ہوئی اور روح ومغز کو لیتے الفاظ پر اکتفانہ کرتے ۲۴؎ یہ پوری کتاب دراصل قرآنی حکمت کے تعارف کے لیے لکھی گئی ہے۔سب سے پہلے حکمت کا مفہوم اور اس کے مختلف اطلاقات پر گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد حکمت کا درجہ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ثبوت میں آیات قرآنی سے استدلال کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا:

یوتی الحکمة من یشاء ومن یوت الحکمة فقد أوتی خیراً کثیراً

یعنی اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت عطا ہوئی وہ خیر کثیر سے نوازا گیا۔پھر حکمت کے مختلف درجات کا بیان ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ تزکیہ وتقویٰ حکمت کا بلند

ترین معیار ہے درجات حکمت کے بیان کے بعد ثمرات حکمت کا تذکرہ ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ حکمت کا ظہور جس شکل میں ہوتا ہے وہ ثمرہ حکمت کہلاتا ہے اور اس ثمرۂ حکمت کے مختلف نمونے قرآن کریم اور سابقہ کتب سماویہ سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ثمرۂ حکمت کی چند بنیادی تعلیمات کو ۱۶/سولہ دفعات میں پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ہے قرآن حکمت کے لیے انسان کا مطالعہ' انسان دراصل قرآن کا اصل موضوع، اس کا جوہر نور سے متفرع ہے اس کی فطرت مستقیم ہے اور اس کا سچا ظہور انبیائے کرام علیہم السلام کی ذات برکات میں ہوتا ہے مولانا نے چار پہلوؤں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے اولاً روح میں نوری امتزاج ثانیاً عقل میں نوری امتزاج ثالثاً قلب میں نوری انشراح اور رابعاً نفس میں نوری امتزاج اور اس کا ظہور ایمان واعتقاد، طہارت و پاکیزگی، نیکی و عمل کی سچائی اور پاکیزگی و ستھرائی وغیرہ کی صورت میں منعکس ہوتا ہے۔ ان حقائق کو نہ صرف آیات واحادیث کی روشنی میں سمجھایا گیا ہے بلکہ جدید سائنس کے حوالہ سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرے باب کا موضوع ہے قرآنی حکمت کے لیے سماج کا مطالعہ اس باب میں سماج کی ابتدائی تشکیل سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ سماج کی تشکیل بغیر آسمانی رہنمائی کے مکمل ہی نہیں ہوسکتی اور اس سلسلہ میں طبعی قوتیں اور امکانی صلاحیتیں انسان کی مدد اور رہنمائی کے لیے ناکافی ہیں پھر یہ بتایا گیا ہے۔ کہ تشکیل سماج میں آسمانی مدد و رہنمائی کا کیا کردار ہے، اس سلسلہ میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمانی رہنمائی نوری کرنوں کو غذا پہونچاتی ہے جو زندگی کے طلب و رسد میں توازن کو برقرار رکھتی ہے لیکن چونکہ اب وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اس لیے اس دور میں سماج کی مدد و رہنمائی کے لیے حکمت کا وجود برقرار ہے جو ہر زمانہ اور ہر وقت کے لیے یکساں طور پر ممد و معاون ہوتا ہے۔ یہ حکمت دراصل عوامی شعور کی کیفیت اور سماجی برداشت کی طاقت کا نام ہے۔ اس کی حیثیت اس قالب اور ڈھانچہ کی ہے جو سماج کے جسم سے تیار ہوتا ہے اور اس کی بیماریوں کی تجویز و تشخیص اس طبیب حاذق کے کام کی طرح ہے جس کی نظر مرض کی قوت، اس کی نوعیت، مریض کی عمر، جائے

رہائش، موسم، دوا، اور غذا کی قوت ان کی خاصیت واثر اور پرہیز سے متعلق باتوں پر ہوتی ہے۔ جن کو ملحوظ رکھ کر وہ بہت سی ان باتوں کی خبر دیتا ہے جن کی باریکیوں تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہیں ہوتی یہی بات ہے جسے شاہ ولی اللہ دہلوی نے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے کہتے ہیں۔

انما مثله كمثل الطبيب يعمل الى حفظ المزاج المعتدل فى جميع الاحكام فتختلت احكامه باختلاف الاشخاص والزمان فيا مر الشاب بما لايأ مر الشائب ويأمر فى الصيف النوم فى الجولمايرىٰ ان الجو مظنة الاعتدال حينئلا و يأ مرفى الشتاء بالنوم داخل البيت لمايرىٰ أنه مظنة البرد حينئذ ......یعنی اس کی مثال طبیب جیسی ہے کہ وہ ہر حالت میں معتدل مزاج کی حفاظت ضروری سمجھتا ہے، اس کی تشخیص وتجویز سے متعلق احکام زمانہ اور اشخاص کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں چنانچہ وہ جوان کے لیے جو تجویز کرتا ہے بوڑھے کے لیے وہ نہیں کرتا ہے موسم گرما میں کھلی فضا میں سونے کے لیے کہتا اور موسم سرما میں گھروں کے اندر سلاتا ہے موسم کے اس اختلاف کی بنا پر مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کی خاطر اپنی ہدایت کے اختلاف کو وہ ضروری قرار دیتا ہے اور اس پر اس کے عمل کا درآمد ہوتا ہے۔

بہر حال سماج کی بہتر رہنمائی کے لیے قرآنی حکمت کا مطالعہ سخت ضروری ہے اور جیسے جیسے حکمت کی تہیں کھلتی جائیں گی سماج کی بہتر رہنمائی ممکن ہو سکے گی اور قرآن مجید کی گہرائی سے مطالعہ کے بغیر اس حکمت کا حصول ناممکن ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ہے ''قرآنی حکمت کے لیے کائنات کا مطالعہ'' یہ اس کتاب کا آخری باب ہے اس باب میں کائنات سے متعلق جو قرآنی آیات ہیں اور نظام کائنات میں جو الوہی حکمتیں پوشیدہ ہیں ان پر غور وفکر کی دعوت دی گئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم میں کائنات سے متعلق تقریباً سات سو پچاس (۷۵۰) آیات ہیں جن میں مظاہر کائنات، حقائق وموجودات، محاسن کائنات مناظر فطرت اور مظاہر قدرت نیز تسخیر کائنات کا ذکر ہے، زمین، پہاڑ، دریا، نہریں کھیتی، سورج، چاند، ستارے، بارش آگ وغیرہ کا ذکر کر کے، یتفکروں، یتذکرون اور یعقلون وغیرہ

الفاظ کے ذریعہ غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔

یہ قرآن کی وہ حکمتیں ہیں جن کے بغیر نہ تو ہم انسان کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ کائنات کو اور اگر ہمیں یہ رہنمائی حاصل نہ ہوتو انسان کی رہنمائی ناقص اور نامکمل رہے گی۔

زیر مطالعہ کتاب کے ذریعہ ہمیں ہدایت و رہنمائی کا یہی جو ہر حاصل ہوتا ہے اور قرآنی حکمتوں پر غور وفکر کرنے کی صلاحیت کو جلا ملتی ہے۔ غالباً مولانا مرحوم کی یہ آخری باقاعدہ کتاب ہے ان کا ارادہ تھا کہ انھیں مقدمات کو پیش نظر رکھ کر باقاعدہ قرآن کی تفسیر لکھیں مگر افسوس ان کا یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا اور بقول حضرت علیؓ عرفت ربی بفسخ العزائم۔ بہر حال یہ کتاب قرآن حکمتوں کو سمجھنے کے لیے ایک شاہ کلید ہے اس پر غور کرنے سے علم وحکمت کے کئی بند در کھلنے کے امکانات ہیں۔

۱۱- مراسلات علمی ودینی:

مولانا مرحوم کی یہ کوئی باقاعدہ اور مستقل کتاب نہیں بلکہ یہ ان مراسلات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۵ء تک کے زمانہ کو محیط ہے ان میں سے اکثر کی اشاعت باقاعدہ احتساب کے صفحات میں بھی ہوچکی ہے۔ یہ مراسلات علمی اور دینی نوعیت کے سوالات اور مشوروں کا مجموعہ ہیں جس پر حصہ اول تحریر ہے مگر غالباً حصہ دوم کے اشاعت کی نوبت نہ آسکی غالباً مولانا کا ارادہ یہ تھا کہ دیگر اہم مراسلات کا مجموعہ حصہ دوم بھی پیش کریں گے مگر انھیں مہلت نہ مل سکی اور وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہ کرسکے۔ اوراس طرح یہ حصہ پہلا اور آخری حصہ ثابت ہوا۔

بہر حال زیر نظر کتاب بھی علم وحکمت اور فکر ودانش کا ایک شاہکار ہے جو بہت سے دینی، علمی، سیاسی، سماجی اور اجتماعی مسائل کے پرتوں کو کھولتی ہے اور ہر سوچ وفکر بالخصوص جدید ذہن کے لیے سوچنے کا سامان فراہم کرتی ہے۔ یہ کتاب دراصل اپنے عہد کی ایک ملی تاریخ بھی ہے جس میں کشمکشہائے سیاست ملیہ کے بہت سے راز بھی کھلتے ہیں جو ہمارے تاریخ کا حصہ رہے ہیں مگر ان کی نقاب کشائی نہیں ہوئی تھی اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم نے ملی مسائل میں بھی

بھرپور کردار ادا کیا ہے اور وہ اس قوم کی خوبیوں اور خامیوں کے رمز شناس بھی تھے جو کتاب کے مندرجات سے جگہ جگہ مترشح ہوتا ہے۔

یہ کتاب حالانکہ مراسلات کا مجموعہ ہے مگر انھیں دس عنوانات کے تحت الگ الگ خاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو یہ ہیں۔

قرآن حکیم، حدیث نبوی، قانون واجتہاد، اسلامی نظام، مسلم پرسنل لاء، فقہی مسائل، تشکیل جدید، طریق مطالعہ کی غلطی، نوجوانوں کے سوالات اور ایک سوالنامہ۔

ان عناوین کے تحت جو سوالات اور جوابات ہیں وہ بہت اہم ہیں جو کم ہی کسی کتاب میں یکجا مل سکیں گے۔ ہم اس سلسلہ میں تھوڑی سی تفصیل یہاں بیان کریں گے تا کہ بات مکمل ہو سکے پہلا باب قرآن حکیم سے متعلق ہے جس میں درج ذیل اہم مباحث کا وسایل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب میں قرآنی تعلیمات کی طرف سے مفکرین کی عدم توجہی، قرآنی حکمت کے تعلیم کے طریقے، قرآن مجید موجود سائنسی دور کی رہنمائی قرانی دستور کا امتیاز قرآن کی سورتوں میں مکی و مدنی کی تقسیم نیز نزولی اور توقیفی ترتیب کا مطلب حروف مقطعات کے متعلق مولانا کی رائے، سورۃ والعصر کی تفسیر وغیرہ کے مسائل شامل ہیں۔

دوسرا باب حدیث نبوی سے متعلق ہے۔ اس میں احادیث رسول پر بعض مستشرقین کے الزامات کے جوابات دئے گئے ہیں نیز حدیثوں کی جمع وترتیب حدیث کا درایتی معیار اور ان پر داخلی اور خارجی نقد کے طریقے، حدیثوں کی نقد وتحقیق میں افراط تفریط کے شکار گروہ، مقام نبوت کے متعلق سوالات مشہور مصری ادیب ومحقق احمد امین کے حدیثوں کے اصولوں پر نقد وتبصرہ پر تبصرہ۔ میلاد کی کتابوں میں پڑھی جانے والی روایتوں کی فنی حیثیت حصول علم کی اہمیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ، زکوۃ روپیوں کا نصاب وغیرہ مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرا باب: قانون واجتہاد کے نام سے موسوم ہے اس باب میں قانون کے ابتدائی

تصورات رومن لاء کی ترتیب وتدوین سے متعلق معلومات اسلامک اور رومن لا کے درمیان فرق و امتیازات اور مستشرقین کے گمراہ کن پروپیگندہ کا جواب، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، قانون کے بقاء واستحکام کی حفاظت کے طریقے، سیکولر حکومتیں اوران کی پالیسیاں اوراسلامی نقطہ نظر سے ان کی خوبیاں اور خامیاں، اسلامی قوانین میں غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت، بین الاقوامی اداروں کے ساتھ اسلامی حکومت کے تعلق کی پالیسی، مسلم پرسنل لا سے متعلق بعض مسائلل اور جدید معاشی ومالیاتی نظام سے متعلق سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں۔

چوتھا باب اسلامی نظام سے متعلق ہے۔اس باب میں اسلامی نظام کے قیام کے تئیں مولانا کی واضح فکرمندی جھلکتی ہے جس کا اندازہ اس باب میں درج شدہ مباحث سے ہوتا ہے۔اس باب میں موضوع کے درج ذیل پہلوؤں پر کلام کیا گیا ہے۔

موجودہ دور میں اسلام کی ہداہت ورہنمائی کا چیلنج، اسلامی حکومت میں غیر مما لک سے اقتصادی، فوجی اور ٹیکنیکل امداد کا حصول اور موجودہ بین الاقوامی بینکوں سے شرح سود پر قرض لینا، اسلامی نظام کے قیام میں داخلی اور خارجی مشکلات، اسلامی حکومت میں غیر مسلم کی سربراہی کا مسئلہ اسلامی ملک میں اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ، اسلامی حکومت میں صلح وجنگ کے مسائل نیز اسلامی حکومت میں خواتین کے حقوق وغیرہ مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

پانچواں باب مسلم پرسنل لاء کے عنوان سے شامل کتاب ہے اس باب میں مسلم مسائل کے تعلق سے مولانا کی فکرمندی جھلکتی ہے، اس باب میں مسلم پرسنل لاء کا تحفظ مجلس تحقیقات شرعیہ کے قیام کی غرض وغایت مجلس کا اپنے قیام کے مقصد سے غفلت وبے اعتنائی، مجلس کے ذمہ داران سے مولانا کے اختلاف کی نوعیت مسلم پرسنل لاء سے متعلق کاموں کی نوعیت اجماع کے انعقاد کی شرائط، موجودہ دور میں اجتہاد کی ضرورت وغیرہ۔

چھٹا باب فقہی مسائل پر مبنی ہے جن میں مختلف مذہبی مسائل پر کلام کیا گیا ہے۔ مثلاً سن

ہجری کے آغاز وابتداء کی نوعیت، کرنسی نوٹوں کی ثمنیت مسائل زکوٰۃ، شادی، بیاہ کے موجودہ رسم ورواج پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ، سورج کے طلوع وغروب کے مسئلہ میں اوقات نماز کی تعین، ضبط ولادت کے مسائل، ہندوستان کی شرعی حیثیت، رویت ہلال کے مسائل اعضائے جسم کا عطیہ اور پوسٹ مارٹم وغیرہ کے مسائل وغیرہ۔

ساتواں باب تشکیل جدید سے متعلق ہے یعنی فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی کیا نوعیت ہے یہ دراصل جمیعۃ العلماء کی جانب سے منعقد ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر نقد وتبصرہ ہے اس میں بعض شرعی احکام کی تعبیر وتشریح جیسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔

آٹھواں باب طریق مطالعہ کے غلطی کے نام سے موسوم ہے۔ اس باب میں مولانا نے دو اہم سوالوں کے جواب دیئے ہیں پہلا سوال ڈاکٹر جاوید حبیب صاحب ایڈیٹر ہجوم کا ہے جس میں انھوں نے جزوکوکل یا کل کو جزو بنا کر پیش کئے جانے کی روش پر متنبہ کیا ہے۔ مولانا نے اس کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ افسوس ہے یہ طریقہ اس قدر رواج پاچکا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین بھی اس الزام سے بری نہیں مثلاً فرائڈ جس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو جنس کی عینک سے دیکھا اور اس پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھی یا کارل مارکس جس نے معاشیات اور طبقاتی ناہمواریوں تک اپنی نظر کو محدود رکھا اور انسانوں کے دیگر مسائل اور ضروریات مثلاً روحانیات وغیرہ کو اپنی بحث ومطالعہ سے خارج کردیا۔ یہی حال ہمارے مذہبی حلقوں میں بھی پیش آیا جنھوں نے خواب، کشف اور اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا کر پیش کیا اور زندگی کے اہم مسائل سے غفلت برتی۔ یہ بہر حال طریق مطالعہ کی ایک غلطی ہے صحیح طریقہ یہی ہے کہ اشیاء کو اس کے محل میں رکھ کر دیکھا جائے اور ہر چیز کو اتنی ہی اہمیت دی جائے جس کی وہ مستحق ہے۔ جزئیات کو کلیات پر مقدم رکھنے سے وہ نتائج حاصل نہیں کئے جاسکتے جو اصل ہدف ہے۔

اسی طرح مولانا نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ آج کل معروضی مطالعہ کی ایک قسم چل پڑی ہے

جس کا مطلب یہ ہے کہ موضوع سے متعلق ہر قسم کی معلومات کو جمع کرلیا جائے اور پھر غیر جانبدار ہو کر اس سے نتیجہ نکالا جائے مثلاً مذہب کا معروضی مطالعہ یہ ہے کہ اس کے نام سے صحیح یا غلط جو کچھ تاریخ میں پایا گیا اس کو مذہب سمجھ کر جمع کرلیا جائے پھر اس کو مذہب سمجھ کر اس کی روشنی میں رائے قائم کی جائے بظاہر یہ مطالعہ کا طریقہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں آزادانہ غور وفکر کا موقع ملتا ہے لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو موضوع بجائے خود انکشاف حقیقت کی حیثیت رکھتے ہوں مثلاً مذہب اور پیغمبر وغیرہ ان میں بالخصوص اس طریقہ مطالعہ کی خامی یہ ہے کہ انسان معلوم اجزاء پر خود ساختہ عقلی استدلال کا رنگ چڑھا کر اپنی مرضی کا نتیجہ نکال لیتا ہے کیوں کہ جذبات کے علاوہ انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر نہ معلوم کن کن نظریات وافکار سے متاثر ہوتا رہتا ہے اور یہ تاثر معلوم اجزا سے نتیجہ نکالنے میں ظاہر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ پہلے ان اسکالروں کا مطالعہ ہونا چاہیے کہ یہ حضرات کس حد تک معروضی ہیں پھر اس طریق مطالعہ کے وجود اور جواز پر گفتگو ہونی چاہیے۔

نویں باب میں نوجوانوں کے سوالات ہیں جو ان کی نفسیات کی نمائندگی مثلاً نوجوان نسل میں بے چینی کے اسباب، دولت کمانے کی ہوڑ تکمیل دین کا مفہوم مختلف دینی تنظیموں کی نوعیت اور ان کے ساتھ اشتراک اتحاد امت اور اس کا طریقہ کار، مسلمانوں میں تنظیمی معاملات کا فقدان، مسلم پرسنل لاء اور اجتہاد اور اس میں حکومت کی مداخلت کے امکانات۔ مذہب اور زندگی کا باہمی تعلق، وحدت ادیان، قومی یکجہتی، مذاہب میں اتحاد واختلاف کی بنیادیں اسلامی نقطہ نظر سے، نئی صدی ہجری سے متعلق مذہبی رہنمائی مذہبی معاملات میں عقل کے مداخلت کی کمیت وکیفیت وغیرہ مسائل پر اس باب میں کلام کیا گیا ہے اور نوجوانوں کے سوالات کے شافی اور کافی جوابات دیئے گئے ہیں۔

دسواں اور آخری باب ایک سوالنامہ ہے جسے جماعت اسلامی ہند کی مجلس شوریٰ منعقدہ ۵/ جولائی ۱۹۶۵ء کی جانب سے تیار کیا گیا تھا اور اس میں یہ سوال زیر غور آیا تھا کہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کے تحت ہونے والے الیکشن میں کن صورتوں میں کس حد تک اور کن شرائط کے ساتھ

حصہ لیا جا سکتا ہے اور جماعت اسلامی کو اس سلسلہ میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے جماعت نے یہ سوالنامہ ملک کے علماء اور ارباب فکر و دانش کے سامنے رکھ کر جواب مانگا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا کا موقف یہ تھا کہ اقامت دین کی جدوجہد کے لیے ضروری ہے کہ اپنا ملی وجود برقرار رکھتے ہوئے الیکشن میں شرکت سے دریغ نہ کیا جائے۔ مولانا کا کہنا تھا کہ سیکولر نظریہ کو بطور ایک عقیدہ تسلیم کرنا اور بات ہے اور محض کاربراری کے لیے ناگریز حالات کی بنا پر حکومتی سطح پر اس کو مان لینا دوسری بات ہے۔ ان دونوں کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔

بہر حال مولانا کا نقطہ نظر سے اس سلسلہ میں بڑا صاف تھا اور قرآن وسنت اور اصول فقہ کے ضروری دلایل سے اس میں استدلال کیا گیا تھا اور بالآخر ایک طویل مدت کے اضطراب اور کشمکش کے بعد جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے الیکشن میں شمولیت کا فیصلہ کر ہی لیا اور اپنی ایک پارٹی کھڑی کر لی جو سیاسی معاملات میں جماعت اسلامی کی نمائندگی کر سکے۔

ان سطور پر یہ دوسرا باب ختم ہوسکتا ہے۔ اس میں ہدایت القرآن کے نام سے مولانا نے جو تفسیر لکھی تھی۔ وہ چوں کہ ہمیں میسر نہ آسکی اس لیے اس پر گفتگو رہ گئی ہے باقی کتابیں نئی طبع شدہ کتابوں میں ضم ہیں اس لیے ان پر الگ سے تبصرہ کی کوئی ضرورت نہیں مثلاً ''مقالات امینی'' نامی کتاب میں شامل تینوں مقالے اجتہاد کا تاریخی پس منظر میں آگئے ہیں۔ اسی طرح انشورنس وغیرہ سے متعلق مولانا کی جو رائے ہے وہ ''اسلام اور جدید دور کے مسائل'' نامی کتاب میں آچکے ہیں تقریباً یہی حال دوسرے مقالات اور کتابچوں کا بھی ہے۔ اب ہم اگلے باب میں فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے عروج وارتقاء کے موضوع پر گفتگو کریں گے تاکہ اس پس منظر میں مولانا امینیؒ کے کاموں کی صحیح نوعیت متعین ہو سکے اور ان کی خدمات فقہیہ سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہو سکے۔

وماتوفیقی الا باللہ

حواشی

(۱) کتاب الاموال لابی عبید، ص۹۹۔

(۲) حوالہ بالا۔

(۳) کتاب الخراج لابی یوسف ص۱۰۳۔

(۴) اسلام کا زرعی نظام از محمد تقی امینی، ص۹۳۔

(۵) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو زیرتبصرہ کتاب کے صفحات ۹۴-۹۵

(۶) اسلام کا زرعی نظام از محمد تقی امینی ص،۱۰۔

(۷) مقالات امینی، ناشر ادارۂ علم و عرفان سن اشاعت دسمبر ۱۹۷۲ء۔

(۸) ملاحظہ ہو زیرنظر کتاب کا صفحہ ۲۱۴-۲۱۸۔

(۹) تلخیص باب مفاہمت بین المذاہب، از اسلام اور جدید دور کے مسائل، ص۳۲۰-۳۳۵۔

(۱۰) تہذیب جدید کی تشکیل از مولانا تقی امینی ۱۸، شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۴۔

(۱۱) حدیث کا درایتی معیار ص،۱۱، از محمد تقی امینی شائع کردہ، ندوۃ المصنفین دہلی سن طباعت، ۱۹۸۰ء۔

(۱۲) حوالہ بالا ۱۹۰۔

(۱۳) احکام شرعیہ میں حالت و زمانہ کی رعایت ص۲۱، ۲۲، از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ: ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی سن طباعت ۱۹۷۰ء۔

(۱۴) حوالہ بالا ص۲۵، ۲۷ ملخصاً۔

(۱۵) حوالہ بالا ص۳۰، ۳۱۔

(۱۶) تلخیص از کتاب عروج و زوال کا الٰہی نظام مصنف مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی سن اشاعت ۱۹۸۹ء۔

(۱۷) از مولانا محمد تقی امینی صفحات ۱۷۵ شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی، سن اشاعت ۱۹۶۵ء

(۱۸) لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ص ۴۰ از محمد تقی امینی بحوالہ تاریخ اخلاق یورپ۔

(۱۹) حوالہ بالا ص ۴۲۔

(۲۰) ابوبکر محمد بن ابی سہیل السرخسی، اصول السرخسی، الجزء الثانی فصل فی بیان طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی اظہار الشرع، بحوالہ کتاب بالا ص ۱۵۔

(۲۱) حوالہ بالا ص، ۲۱۔

(۲۲) حوالہ بالا ص ۴۔

(۲۳) سورۃ النساء ۸۳۔

(۲۴) الاحزاب ۲۴۔

(۲۵) حکمت القرآن ص ۱۳-۱۴ مطبوعہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

باب سوم

فقہ کی اہمیت تاریخ اور اس کا آغاز وارتقاء

فقہ کی اہمیت تاریخ اور اس کا آغاز وارتقاء

فصل اول

فقہ کا مفہوم اور اس کے موضوعات

فقہ کا مفہوم:

فقہ لغۃ علم کو کہتے ہیں مشہور ماہر لغت ابن فارس کے نزدیک کسی چیز کا علم فقہ کہلاتا ہے۔ جب کہ دوسرے ماہرین کے نزدیک فقہ کی تعریف یہ ہے:

العلم بالشئی مع الفهم له، والفطنة یعنی وہ علم کے ساتھ فہم نیز ذکاوت اور ہوشیاری کو شرط قرار دیتے ہیں [۱]

علامہ ابن الاثیر الجزریؒ اور علامہ زمخشریؒ کی رائے میں فقہ کے معنیٰ ہیں **الفقه حقيقته الشق والفتح** یعنی کسی چیز کو پھاڑنا اور کھولنا فقہ کہلاتا ہے۔ مشہور ماہر لغت امام راغب الاصفہانی اپنی مفردات میں لکھتے ہیں۔ **الفقه هو التوسع علىٰ علم غائب بعلم شاهدٍ وهو أخص من العلم** یعنی موجود علم کی مدد سے غائب علم میں توسع پیدا کرنا، علم عام ہے اور رفقہ خاص فقہ ف کے کسرہ کے ساتھ مستعمل ہے یہ باب کرم سے آتا ہے **فَقُهَ** کا مطلب ہوا صار **فقيهاً** فقہ کا علم ہونا اس طرح تفقہ باب تفعل سے مستعمل ہے جس کے معنی ہیں تعاطی العلم وباحثہ فی العلم یعنی علم فقہ میں ایسی مہارت جس اس میں اسے ملکہ پیدا ہو جائے یہیں سے اہل عرب کا یہ قول بھی منقول ہے۔

انه فقيه النفس اى له ذوق فقهى بالملكة لا بأمضائه [۲]

بہر حال ان تمام معانی کی روشنی میں مجملاً فقیہ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

الفقيه العالم الذی يشق الاحكام و يفتش عن حقائقها ويفتح مااستغلن منها.
یعنی فقیہ وہ عالم ہے جوفکر وتدبر کر کے قوانین کے حقائق کا پتہ لگائے اور مشکل و مغلق امور کو واضح کرے۔

ظاہر ہے کہ فقہ کی اس گہرائی کو پہونچنے کے لیے ظاہری علوم وفنون میں مہارت کے ساتھ قلب ودماغ کی صفائی اور نفس وروح کی طہارت بھی درکار ہے اس کے بغیر فکر ونظر میں مطلوبہ معیار پیدا ہونا ناممکن ہے چنانچہ امام حسن بصری نے اس حقیقت کے پیش نظر فقیہ میں درج ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں:

فقیہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے اور آخرت کے کاموں سے رغبت رکھے، دین میں کامل بصیرت حاصل ہوا اطاعت پر مداومت کرنے والا پرہیز گار ہو، مسلمانوں کی بے آبروئی اور ان کی حق تلفی سے بچنے والا ہو، اجتماعی مفاد اس کے پیش نظر ہو، شخصی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتا ہو مال کی طمع نہ رکھتا ہو۔[۵]

امام غزالی خاص اسی نکتہ پر زور دیتے ہیں کہ وہ دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں کا ماہر اور رمز شناس اس بنا پر یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ

من لم يكن عالماً باهل زمانه فهو جاہل، یعنی جو اپنے زمانہ کے لوگوں کے حالات سے واقف نہ ہو تو وہ جاہل ہے۔[۶]

فقہ کی اصطلاحی تعریف:

عام طور پر زمانہ مابعد کے علماء نے فقہ اسلامی کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

الفقه حكمة فرعيّة، شرعية: یعنی فقہ شرعی قوانین کے ملکہ استنباط کا نام ہے۔ اس طرح اس کی یہ تعریف بھی منقول ہے۔ **العلم بالاحكام الشرعيه عن ادلتها التفصيليه** یعنی فقہ شرعی قوانین کے علم کا نام ہے جو ان کے تفصیلی دلایل سے حاصل ہو۔ اس کے بعد اس کے

مفہوم میں اور تنگی کی گئی اور اس کی تعریف یوں کی گئی۔ الفقہ مجموعۃ الاحکام الشرعیہ فی الاسلام یعنی شریعت کے عملی احکام کا نام فقہ ہے۔ ۷

مگر صدر اول میں فقہ کا اطلاق اس قدر تنگ نہ تھا اور اس سے مجرد احکام شرعیہ ہی مراد نہیں لئے جاتے تھے اور جزئیات قوانین کے تفصیلی دلائل کے جان لینے کو ہی فقہ کا نام نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ اس وقت اس میں جملہ دینی علوم شامل تھے اور یہ لفظ اسلامی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا جیسا کہ اصول کی کتابوں میں ملتا ہے:

ان الفقه في الزمان التقديم كان متناولاً لعلم الحقيقة وهي الالٰهيات من مباحث الذات والصفات وعلم الطريقةوهي مباحثُ المنجيات والمهلكات وعلم الشريعة الظاهره و علم الشريعة الظاهر . ۸

قدیم زمانہ میں فقہ علم حقیقت یعنی علم الٰہیات جس میں خدا کی ذات وصفات سے بحث کی گئی ہے اور علم طریقت جس میں نجات دینے والے اور ہلاکت میں ڈالنے والے اعمال و افعال سے بحث ہو اور علم شریعت ظاہرہ یعنی جس میں ظاہری احکام و مسائل سے بحث ہو سب کو شامل تھا۔

چنانچہ فقیہ اعظم حضرت امام ابو حنیفہؒ اور دیگر جلیل القدر ائمہ کے بیان سے فقہ کا جو مفہوم متعین ہوتا ہے اس کا خلاصہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

''فقہ ملکہ استنباط اور دینی بصیرت کا نام ہے جس کے ذریعہ احکام شریعت، اسرار معرفت اور مسائل حکمت سے واقفیت ہوتی ہے۔ نیز نئے فروعی مسائل کے استنباط اور ان کی باریکیوں کا علم ہوتا ہے جو شخص اس دینی بصیرت اور ملکۂ استنباط کا حامل ہو وہ فقیہ کہلاتا ہے۔ ۹

مندرجہ بالا تعریف کی رو سے فقہ کسی مخصوص علم وفن میں مقید نہیں تھا بلکہ اس میں مختلف نفع بخش علوم شامل تھے مثال کے طور پر عقائد کے علم کو اس زمانہ میں الفقہ الاکبر کہا جاتا تھا۔ اور امام ابو حنیفہ کی ایک کتاب بھی اسی نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح وجدانیات کے مباحث کو بھی فقہ میں شمار

کیا گیا ہے۔ جو آج کل فقہ کی کتابوں کے ابواب میں شامل ہیں مثلاً مسلم الثبوت میں ہے:

ان تحریم الحسدو الریاء بمن الفقه یعنی حسد اور ریا کا تعلق فقہ سے ہے۔[۱۰]

امام غزالی نے لفظ فقہ کو بھی ان لفظوں میں شمار کیا ہے جن میں اغراض فاسدہ کی بنا پر تصرف کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''لفظ فقہ کے مفہوم میں لوگوں نے خصوصیت پیدا کر لی ہے اب فقہ نام رہ گیا ہے عجیب وغریب جزئیات کے جاننے کا اور ان کے علل واسباب سے واقف ہونے کا اور دیگر ان باتوں کی حفاظت کا جن کا تعلق جزئیات اور ان کے علل واسباب سے ہے جو شخص مذکورہ چیزوں میں زیادہ مشغول ومنہمک رہتا ہے بس وہی فقہ کا زیادہ عالم سمجھا جاتا ہے''[۱۱]

قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں فقہ کی تعریف اور اہمیت:

خود قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں فقہ کا کیا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ تھوڑی سی گفتگو اس پر بھی ہو جائے سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهو فی الدین و لینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهتم یحذرون[۱۲]

پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ مومنوں کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل کر آتی جو دین میں بصیرت اور تفقہ پیدا کرتی تا کہ جب وہ اپنے گروہ میں واپس جاتی تو لوگوں کو (شرک وجہل کے نتائج) سے ہشیار کرتی تا کہ لوگ برائیوں سے بچتے۔

ایک اور جگہ قرآن مجید میں دین میں تفقہ اور بصیرت کے نتائج کا تجزیہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ورحمتی وسعت کل شئی فسا کتبها للذین یتقون و یئوتون الزکاة والذین هم بآیاتنا یومنون الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه

مکتوباً عندهم فی التورة والانجیل یا مرهم بالمعروف وینها هم عن المنکر ویحل لهم الطیبات و یحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم فالذین آمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذی انزل معه اولئلک هم المفلحون۔۱۳؎

ترجمہ:

میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے پس میں اسے لکھ دوں گا ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور پیروی کرتے ہیں اس رسول نبی امی کی جسے وہ اپنے پاس توراۃ وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے۔ اور خباثت کو حرام ٹھہراتا ہے اور انہیں ان بندشوں اور بیڑیوں سے آزاد کرتا ہے جو ان کے اوپر پہلے سے تھیں پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کی مدد وتعاون کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔

پہلی آیت میں فقاہت اور تفقہ کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے وہ ہے جہل وغفلت کے نتائج سے لوگوں کو باخبر کرنا اور لوگوں کو برائیوں سے بچنے کی تلقین کرنا یعنی اس کا مقصد قلب ودماغ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے جس سے حالات ومعاملات کا صحیح تجزیہ کیا جا سکے اور لوگوں کو ہشیار وباخبر کیا جا سکے اس کے بغیر فقہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ امام غزالی اس مقصد کو اپنی کتاب احیاء العلوم میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''فقاہت حاصل کرنے کا مقصد قرآن حکیم میں ''لینذرو قومھم'' بیان کیا گیا ہے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا ہے جب تک کہ صدر اول کی فقہ پر عمل درآمد نہ ہو۔ طلاق عتاق، لعان، وغیرہ فروعی مسائل سے یہ مقصود نہیں حاصل ہوسکتا ہے بلکہ بسا اوقات صرف انہی مسائل

کی طرف توجہ دل کو سخت بنا دیتی ہے اور خوف الٰہی جاتا رہتا ہے جیسا کہ ہم اپنے زمانہ کے ایسے مفتیوں میں مذکورہ باتیں دیکھ رہے ہیں کہ ان کا دل سخت ہو چکا ہے اور خوف خدا رخصت ہو گیا ہے۔[۱۴]

دوسرے قرآنی اقتباس کے متعلق ڈاکٹر عباس حسنی محمد کہتے ہیں:

''ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی ان احکام کے جاننے کا نام ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مشروع فرمایا ہے اور ان کے لیے عدالت، صلاحیت اور استقامت کے حدود متعین فرمائے ہیں تا کہ انسان کی زندگی خیر وفلاح سے ہمکنار ہو جائے اور انھیں پر عمل کر کے اس کی آخرت بھی سدھر سکتی ہے یہی چیز ہے جسے آیت میں ''الرحمۃ الواسعہ'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۱۵]

قرآن مجید کے بعد اب آیئے احادیث نبویہ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ فقہ کا مفہوم اور مقصد وہاں کس طرح بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس سلسلہ کی چند احادیث پیش کی جاتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین.[۱۶]

اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین میں گہری بصیرت (تفقہ) عطا فرماتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد نبوی ہے آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

ان رجالاً یاتونکم من الارض یتفقھون فی الدین فاذا أتوکم فاستوصوا بھم خیرا. [۱۷]

ترجمہ:

لوگ تمہارے پاس دین میں تفقہ وبصیرت حاصل کرنے آئیں گے لہٰذا جب وہ آئیں تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو یہ میری وصیت ہے۔

اس طرح ایک اور جگہ آپ نے ارشاد فرمایا:

رب حامل فقه غير فقيه و رب حامل فقهٍ الىٰ من هو أ فقه منه ۱۸

بہت سے فقہ کے محافظ حقیقۃ حامل نہیں ہیں اور بہت سے فقیہ تو ہیں لیکن جن کی طرف منتقل کرر ہے ہیں وہ ان سے زیادہ فقیہ ہیں۔

یہیں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فقیہ کے لیے وہ فہم وفراست درکار ہے جو عقل وقلب کی رہنمائی سے حاصل ہوتی ہے اور اس لیے فہم مسائل میں عقل وقلب کا توازن برقرار رہنا ضروری ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص جو قلب ودماغ اور فکر ونظر دونوں یا ان میں سے کسی ایک کی رہنمائی سے محروم ہوگیا یا ان کے استعمال میں توازن کو برقرار نہ رکھ سکے تو تشکیل قانون کے معاملہ میں اُسے کوئی خاص مقام حاصل نہ ہوگا خواہ وہ دوسرے اور معاملات میں کتنی ہی مہارت کا ثبوت کیوں نہ دیتا ہو اسی لیے فرمایا ہے کہ:

''اتقوا فراسة المومن فأنه ينظر بنور الله''

یعنی مومن کی فراست سے ہشیار رہو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

فہم وفراست اور تعقل وبصیرت کا بلند ترین معیار وہ ہے جسے قرآن مجید میں ''حکمت'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

''الحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل'' ۱۸

حکمت علم اور عقل کے ذریعہ حق کو پانے کا نام ہے۔

علامہ خازن نے اپنی تفسیر میں الحکمہ کے اطلاقات درج ذیل معانی کے لیے کیے ہیں وہ

لکھتے ہیں حکمت کے معنیٰ ہیں:

(۱) عقل کی رہنمائی اور قلب کی بصیرت

(۲) حقائق اشیاء کی معرفت

(۳) ہر شئی کو اس کے مناسب محل میں رکھنے کی صلاحیت۔

(۴) حق و باطل کے درمیان فیصلہ کی قوت۔

(۵) نفس اور شیطان کی دقیقہ رسی سے آگاہی۔

(۶) شیطانی اور انسانی تقاضوں میں امتیاز کی قوت۔

(۷) برائیوں کی صحیح نشاندہی کر کے علاج کی صحیح تدبیر۔

(۸) مخلوق کے احوال کا علم۔

(۹) معارف واحکام جس سے نفوس انسانی کمال کو پہونچیں۔

(۱۰) خاص قسم کی فراست۔[۲۰]

علامہ خازن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صلاحیت حکمت میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کے ذریعہ انسان کو حقایق کی معرفت حاصل ہو اور اسباب وعلل کی دنیا تک اس کی رسائی ہو۔ غرض حکمت علم انسانی کا وہ جوہر ہے جس کے وجود پر تفقہ کی بنیاد ہے اس کی اہمیت قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ:

يؤ تى الحكمة من يشاء و من يؤ ت الحكمة فقد أ وتى خيراً كثيراً۔[۲۱]

وہ حکمت عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جسے حکمت دے دی گئی اُسے خیر کثیر سے نواز دیا گیا پھر اس حکمت کے بھی درجات و مراتب ہیں اور اس کے سبب سے اعلیٰ درجہ پر انبیائے کرام علیہم السلام فائز ہیں پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ جس قدر قربت و مناسبت ہوتی ہے اور قرآن مجید کے ساتھ جس کا جس قدر رشتہ گہرا ہوتا ہے اسی مناسبت سے حکمت و بصیرت اور تفقہ کی دولت اسے

حاصل ہوتی ہے۔ یہ حکمت ہی کے درجات تھے جس کے مختلف مراتب پر صدیقؓ فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین فائز تھے اور جن کے اجتہادات اور فیصلے وحی الٰہی سے ہم آہنگ ہوجایا کرتے تھے۔

بہر حال یہ فقہ اسلامی کا وسیع ترین مفہوم ہے جو صدر اول میں عام طور پر رائج تھا اور جس کو ہم ایک بار پھر حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں:

تفقہ فی الدین کے مفہوم میں درج ذیل باتیں شامل ہیں۔

آفات نفسانی کی باریکیوں کی پہچان، ان چیزوں کی پہچان جو عمل کو فاسد بنادیتے والی ہوں، راہ آخرت کا علم، آخروی نعمتوں کی طرف غایت درجہ رجحان، دنیا کو حقیر سمجھنے کے ساتھ اس پر قابو پانے کی طاقت، دل پر خوف الٰہی کا غلبہ، وغیرہ امام صاحب نے **لیتفقھوا فی الدین** کے ضمن میں ان باتوں کو داخل مانا ہے۔[۲۲]

لیکن بعد کے زمانوں میں اس مفہوم میں تنگی آتی چلی گئی اور اس تجریدی عمل کے بعد فقہ کا تعلق مخصوص مباحث سے ہوگیا جو عام طور پر یہ ہیں:

۱- عبادات:

یعنی وہ امور جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تعلقات کی استواری کا ذریعہ ہیں اور زندگی میں خاص قسم کی تعبدی احکام کو بجالانے میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ فقہ میں تنگی کا مظہر ہمارا فقہی عباداتی نظام بھی ہے جس میں عبادات کو زندگی کے بعض گوشوں کے ساتھ مخصوص کردیا گیا ہے۔ جب کہ عبادت کا دائرہ تنگ نہیں بلکہ یہ انسان کی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔

۲- معاملات:

وہ امور جن کا تعلق معاشرت اور مالیات وغیرہ سے ہے یا وہ معاملات جو باہمی تعلقات اور اشتراک وتعاون وغیرہ سے متعلق ہیں مثلاً خرید وفروکت، عاریت، امانت اور ضمانت وغیرہ۔

۳- مناکحات:

یعنی وہ مسائل جن کا تعلق نسل انسانی کی بقا اور تحفظ وغیرہ سے ہے مثلاً نکاح، طلاق، عدت، نسب ولایت، وصیت اور وراثت وغیرہ کے قوانین۔

۴- عقوبات:

اس باب میں حدود وتعزیرات اور مختلف طرح کے جرائم اور ان کی سزاؤں سے بحث کی جاتی ہے مثلاً قتل، چوری، خوں بہا، تہمت اور دیت وغیرہ کے اقسام اور مسائل وغیرہ۔

۵- مخاصمات:

اس میں عدالتی مسائل، قانون مرافعہ اور اصول محاکمہ وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔

۷- حکومت وخلافت:

اس میں قومی و بین الاقوامی معاملات، صلح وجنگ کے احکام، وزارت اور محاصل کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ نیز ان مسائل کا بھی تذکرہ ہوتا ہے جو کتاب السیر اور الاحکام السطانیہ وغیرہ کے ضمن میں مذکور ہوتے ہیں۔

یہ وہ مباحث ہیں جو موجودہ علم فقہ کے عام موضوعات ہیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ فقہ ایک ہی مرحلہ میں درجہ کمال کو نہیں پہونچ گئی بلکہ حالات وتقاضوں کے لحاظ سے بتدریج ترقی کرتی ہوں موجودہ مرحلہ تک پہونچی لہٰذا فقہ اسلامی کا ارتقاء ہماری اگلی فصل کا موضوع ہے۔

فصل دوم

فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کا ارتقاء

فقہ اسلامی میں ارتقاء کا مفہوم:

فقہ اسلامی میں ارتقاء کا مفہوم یہ ہے کہ حالات و زمانہ کی تبدیلی اور مرور ایام کے ساتھ لوگوں کے مسائل اور معاملات میں شرعی نصوص کی روشنی میں غور وفکر کرنا اور اسی کے مطابق ان کا حل نکالنا۔ اس کی بنیاد دراصل نبی کریمؐ کی وہ معرفت و مشہور حدیث ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علیٰ رأس مأۃ کل سنۃ من یجدد لھا دینھا [۲۳]

یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت کے لیے مجدد بھیجے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا یہ اللہ رب العزت کی ذمہ داری ہے کہ وہ حالات و زمانہ کے تقاضوں کے تحت امت مسلمہ کو ہر سو سال میں تجدید کے لیے مجددین کی بعثت فرمائے گا۔ حدیث کے الفاظ "**من یجدد لھا دینھا**" کی تنکیر یہ بتاتی ہے کہ یہ لازم نہیں کہ کوئی ایک فرد یا شخص متعین کر کے بھیجا جائے گا بلکہ مختلف شعبۂ حیات کے لیے مختلف مجددین کی گنجائش موجود ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شعبۂ علم میں اس کے اسلامی ماہرین موجود ہیں:

فقہ اسلامی میں ارتقاء کا ہرگز یہ مفہوم نہیں ہے کہ فقہ اسلامی کو عصری حالات کے تابع کیا جائے اور ہر جدید مسائل کو سلجھانے اور حالات و زمانے کے ساتھ اپنی ہم آہنگی ثابت کرنے کے لیے ہم فقہ اسلامی کو جدید اور ترقی پذیر بنانے کی کوشش کریں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جدید پیدا شدہ مسائل کو فقہ اسلامی کی روشنی میں دیکھ اور پرکھ کر اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں اور

ہمارا یہ اجتہاد شرعی ضوابط اور اسلامی حدود کے اندر ہو، اس تعریف کی روشنی میں یہ بات بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ روشنی خیالی اور ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے کسی نص شرعی کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی فقہ اسلامی یا شریعت مطہرہ کے مطابق نہیں ہے۔

یہاں فقہ اسلامی پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا ہے کہ فقہ اسلامی مصالح عامہ یا ضروریات انسانی کو نظر انداز کرتی ہے۔ یہ الزام محض شریعت اسلامی سے جہالت کا نتیجہ ہے، کیوں کہ اس بنیادی حقیقت کو قطعاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ فقہ اسلامی دراصل الٰہی نظام ہے جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل کردہ ہے اور وہ ہستی انسانی ضروریات ومصالح سے پوری طرح باخبر ہے اسی طرح دین اسلامی اللہ رب العزت کا آخری دین ہے اور یہ تمام نظاموں اور شریعتوں کا نچوڑ ہے اور اس میں نہایت باریک بینی کے ساتھ مصالح شرعیہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ مصالح دراصل مصالح عامہ ہی سے عبارت ہیں جس کے تحت ضروریات، حاجیات اور تحسینات وغیرہ آتے ہیں اور ان سے مراد فقہاء کی اصطلاح میں درج ذیل اشیاء ہیں۔ ضروریات پانچ چیزوں سے عبارت ہیں حفظ دین، حفظ جان، حفظ عقل، حفظ نسل اور حفظ مال انہیں کلیات خمسہ بھی کہا جاتا ہے۔ اب آیئے دیکھیں کہ ان کلیات خمسہ سے کیا مراد ہے۔ اور یہ کس طرح مصالح انسانی کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔

حفاظت:- اس کی خاطر عبادتیں مقرر کی گئیں کیوں کہ ان کے بغیر دین کی تشکیل نہیں ہو سکتی تبلیغ وجہاد فرض کیا گیا کیوں کہ ان پر دین کا قیام موقوف ہے۔ اس طرح حفاظت نفس کے لیے قصاص اور دیت وغیرہ کے قوانین مقرر کئے گئے۔ حفاظت عقل کے لیے نشہ آور چیزوں کے استعمال کرنے والے کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ حفاظت نسل کی خاطر نکاح کے احکام مقرر ہوئے اور غیر محل میں شہوت رانی سے منع کیا گیا اور اس کے مرتکب کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ حفاظت مال کی خاطر چوری وغیرہ کی سزائیں مقرر ہوئیں ان کے علاوہ بہت سارے احکام مذکورہ ضروریات کی تکمیل کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں مثلاً کھانے پینے اور رہنے سہنے وغیرہ کے متعلق احکام اور ان

چیزوں سے متعلق احکام وسزائیں جوحرام اور منہیات کے ارتکاب کا سبب بنتی ہیں ان سب کا تعلق نفس اور عقل کی حفاظت سے ہے اس طرح معاملات سیاست وغیرہ سے متعلق احکام حفاظت نسل و مال اور دین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱- مصالح حاجیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن پر کلیات خمسہ کا قیام و بقاء تو موقوف نہیں ہے مگر ان کے ذریعہ زندگی خوشگوار بنتی ہے۔مضرات کا دفعیہ ہوتا ہے مشقتوں اور کلفتوں سے نجات ملتی ہے اور زندگی کی تمام ان پر خطر راہوں پر قابو حاصل ہوتا ہے جن پر قابو پائے بغیر نہ حقیقی تمدنی زندگی حاصل ہوتی ہے اور نہ مدنیت صالحہ پیدا ہوتی ہے۔ان مصالح کے حصول اور مضرات کے دفعیہ کے لیے بہت سے معاملات مثلاً خرید وفروخت،شرکت بٹائی اور کرایہ وغیرہ کے احکام مقرر ہوئے ہیں اور پھر ان مصالح کو مکمل بنانے کے لیے مہر طلاق اور کفارہ وغیرہ سے متعلق احکام ہیں۔

۲- مصالح تحسینیہ یہ بھی ان مصالح سے متعلق ہیں جن پر نفس زندگی کا قیام و بقا تو موقوف نہیں ہے لیکن انسان کو دائرہ انسانیت وشرافت میں رہنے کے لیے ان کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے مثلاً عمدہ اخلاق اچھی عادتیں،عالی ظرفی اور بلند حوصلگی وغیرہ۔

اس سلسلہ میں اخلاقی اصول وضوابط مقرر کئے گئے ہیں نیز تلقین وترغیب کے ذریعہ ان پر کار بند ہونے کی تاکید کی گئی ہے ان کے علاوہ تعلیم و گفتگو کھانے پینے کے آداب ، معاشی اور معاشرتی زندگی میں اعتدال وتوازن پیدا کرنے کے احکام کا تعلق وغیرہ انہیں مصالح سے متعلق ہے اسی طرح ان کے حصول کی راہ میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں یا کسی طرح بھی اثر انداز ہوسکتی تھیں۔ان سب پر پابندی لگائی گئی مثلاً گندی اور ناپاک چیزوں کے استعمال سے روکا گیا اور پاکیزہ چیزوں کے استعمال کا حکم دیا گیا۔کیوں اخلاقی زندگی بڑی حد تک ان سے متاثر ہوتی ہے نیز صدقہ اور خیرات کے استعمال سے متعلق احکام عفو درگزر کی ترغیب میں دین میں نرمی وسہولت وغیرہ کا تعلق اسی قسم کے مصالح کے حصول اور دفع مضرت سے ہے۔[۲۴] علاوہ ازیں ان مصالح ثلاثہ کے علاوہ

ان کی مکملات بھی ہیں جو ان ضرورتوں اور مصلحتوں کی تکمیل کرتی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد یہ خیال کرنا قطعاً مناسب نہ ہوگا کہ کوئی حقیقی عصری ضرورت یا مصلحت کسی بھی درجہ میں شریعت اسلامی میں نظرانداز کی گئی ہے۔ اور اگر واقعی کوئی چیز اس کے بعد بھی نظر انداز ہوتی ہے تو وہ مصالح نہیں مفاسد ہوں گے۔ علاوہ ازیں فقہاء اسلام نے ہر حکم کو اس کے علت کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ کیونکہ مشارع حکیم سے یہ بات مستبعد ہے کہ وہ کوئی حکم بلا وجہ وسبب بیان کرے اور اگر کسی حکم میں ایسا پایا جاتا ہے یعنی اس کی علت نہیں بیان کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی وقتی مصلحت تھی جو موجود واقعہ کے ساتھ ختم ہوگئی۔ شریعت اسلامی کی یہ لچک اسے ہر زمان ومکان کے مسائل سے ہم آہنگ کرنے اور ان کو حل کرنے میں بہت مدد ومعاون ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں فقہ حنفی سے ایک مثال بیان کرتے ہیں جس سے واضح ہو گا کہ رفع علت سے کس طرح حکم میں تبدیلی آجاتی ہے۔ امام احمدؒ نے اپنی سند میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے، انّ النبیؐ نہی اعن بیعٍ وشرطٍ۔

یعنی نبی کریم ﷺ نے شرط کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ اس حدیث کی رو سے عقود میں شرط جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث اگرچہ کہ علماء حدیث کے نزدیک کمزور ہے مگر احناف اسے صحیح قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے یہاں یہ اصول موجود ہے کہ معاہدات میں شرط رکھنا اصلاً ممنوع ہے۔ اس میں اباحت اصل نہیں لیکن اس اصول کے باوجود جب انہوں نے دیکھا کہ تبدیلی زمانہ کے ساتھ بعض معاملات میں معاہدات میں شروط عادات اہل زمانہ میں شامل ہوگئی ہیں تو علماء احناف نے اہل زمانہ کی اس مصلحت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے حل کی سبیل تلاش کرنی شروع کی تو مذکورہ حکم کی علت میں انہوں نے یہ پایا کہ دراصل اس نہی کی اصل وجہ ''رفع نزاع'' ہے مگر چونکہ اس زمانہ میں یہ علت ختم ہوگئی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو لوگوں کے درمیان اس طرح کے معاہدات کی گنجائش باقی نہیں رہتی پس اس بنا پر انھوں نے بجا طور پر یہ فیصلہ کیا کہ

موجودزمانہ میں بعض معاملات میں اس علت کا اطباق نہیں ہورہاہے لہٰذا شرط اورنص کا جواختلاف پہلے زمانہ میں تھا وہ رفع ہو چکا ہے اس لیے مذکورہ اصول یہاں لاگونہیں ہوسکتا۔

اس کی دوسری بڑی مثال مسئلہ غلامی ہے۔غلامی اسلام میں کس بھی طرح پسندیدہ نہیں رہی ہے مگر چوں کہ عہداوائل میں دوسری حکومتوں کے عدم تعاون کی علت موجودتھی اس لیے اسے یک طرفہ طور پرختم بھی نہیں کیا جاسکتا تھا مگر جیسے ہی یہ علت رفع ہوئی اسلام میں بھی غلامی کا باب بندہوگیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکم اور مصلحت کے درمیان اگرکوئی تعارض پایا جائے اورحکم اور مصلحت میں کوئی حقیقی تعارض نہ ہو۔اورجس علت کی بنا پر سابقہ حکم لگایا گیا تھا وہ ختم ہوچکی ہوتو اگر مذکورہ مصلحت کا تعلق، عادات، معاملات، سیاست، معاشیات یااس طرح کے دیگرامور سے ہوتو اس میں اصل اباحت ہے یعنی ان مصالح کا خیال رکھا جائے گا الا آنکہ اس میں سے کوئی خاص جزئیہ کسی نص عام یا خاص سے مقید کردیا گیا ہواوراگر معاملہ عقایداورعبادات سے متعلق ہوتواس کی اصل حرمت ہے یعنی موجودعقائدوعبادات میں کسی طرح کی کوئی کمی یازیادتی نہیں کی جائے گی اور اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث ہے۔

من أحدث في امرنا ماليس منه فهو رد.

یعنی جس نے ہمارے معاملہ میں کسی نئی چیز کا اضافہ کیاتو وہ مردود ہے۔

اب ایک دوسری مثال دیکھیں اگرکسی معاملہ میں یہ صورت حال پیش آئے کہ نص اور مصالح عامہ میں تعارض پایا جائے۔مگر یہ مصالح شریعت کی نظرمیں معتبر نہ ہوں تووہ حکم برقرار رہے گا اوراس مصلحت کووہمی اورخیالی سمجھا جائے گا۔مثال کے طور پراس دورمیں آزادی نسواں کا بہت شور ہے اورمساوات مردوزن کوآج کے زمانہ کا بہت بڑاایشو ماناجارہاہے تو کیااس وقتی مصلحت کو نظرمیں رکھتے ہوئے شرعی لحاظ سے دونوں کو یکساں مقام دیا جائے۔آیئے مذکورہ اصول کی روشنی میں اس مسئلہ کودیکھیں۔اللہ تعالیٰ کاارشاد ہے۔

الرجال قوامون علیٰ النّساء بما فضل اللہ بعضھم علیٰ بعض و بما انفقوامن اموالھم ۔ ۲۱

یعنی مرد عورتوں کے قوام (سربراہ، نگراں، محافظ) ہیں اس بناء پر کہ جو اللہ کے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ وہ اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مرد کی عورت پر قوامیت کی دو علتیں بیان کی ہیں ایک تو ان کی خلقت اور بناوٹ ہے جو تبدیلی زمان ومکان کے ساتھ کبھی مُبدّل نہیں ہوسکتا اور دوسری شرعی علت مرد کا عورت پر مال خرچ کرنا ہے جس کی مخالفت آج کل ہوسکتی ہے اور ہو رہی ہے۔ لیکن پہلی مصلحت کو بہر حال تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت سے زیادہ ذہنی اور جسمانی قوت عطا فرمائی اور وہ معاملات زندگی کو زیادہ بہتر طریقہ سے برتنے پر قادر رہے کیوں کہ مرد تعقل پسند اور عورت جذباتی واقع ہوئے ہیں اس کے برعکس عورت چاہے جتنی تعقل پسند ہو مگر وہ جذباتیت سے کبھی اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ بہر حال اگر علت کا ثانیہ یعنی کسب معاش اور مصلحت انفاق کو تغیر پذیر مان بھی لیا جائے تو علت اولیٰ یعنی دونوں کی خلقت اور بناوٹ بہر حال کس بھی زمانہ میں مختلف نہیں ہوسکتی اور یہ علت ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ ہی رہے گی لہٰذا مرد کی قوامیت بہر حال برقرار رہے گی اور اسے کسی بھی زمانہ میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اگر فقہ اسلامی کی ترقی سے مراد وہ ترقی ہے جو زمانہ اور جگہ کہ تبدیلی سے فطری طور پر لوگوں کے احوال ومعاملات میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے تو یہ شریعت کی نگاہ میں قابل اعتبار ہے لیکن اگر اس سے مرد شرعی مصالح اور عتبارات کو نظر انداز کر کے محض زمانہ کی ہاں میں ہاں ملانا ہے تو یہ ترقی نا قابل اعتبار ہے۔ پھر بھی ضروری کہ حکمت ومصالح کی بنیادیں شرعی حدود کے اندر رہ کر تلاش کا جائیں اور شریعت کو حالات پر منطبق کرنے کے بجائے حالات کو شریعت پر منطبق کیا جائے۔

فقہ اسلامی کی تاریخ:

تاریخی اعتبار سے فقہ اسلامی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- فقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز نبوت سے لے کر آپ کی وفات ۱۰ھ تک

۲- فقہ عہد خلفاء راشدین کے زمانہ تک یعنی ۴۱ھ تک

۳- فقہ صغار صحابہ اور تابعین کے زمانہ سے لے کر دوسری صدی ہجری کے آغاز یعنی عہد بنی امیہ کے خاتمہ تک۔

۴- فقہ اسلامی دوسری صدی ہجری کے آغاز سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے تقریباً نصف تک۔

۵ فقہ اسلامی ۲۵۰ھ سے لے کر آج تک۔

فقہ اسلامی کا پہلا دور:

فقہ اسلامی کا پہلا دور نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ سے وابستہ ہے اور یہی دور فقہ اسلامی کی بنیاد بھی ہے۔ اس دور میں تنہا آپ کی ذات مبارکہ ہر طرح کے قانونی فیصلوں اور مسائل حیات کو حل کرنے کے لیے جملہ اختیارات رکھتی تھی۔ اس دور میں مسائل اور مشکلات حیات کی قلت کے سبب نہ تو فقہ کی باقاعدہ کوئی تدوین کی گئی اور نہ اس کی کوئی ضرورت تھی۔ ایک صالح اور سادہ زندگی کے جو مصالح یا مسائل ہوسکتے ہیں اور جہاد و عمل کے لیے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہوسکتی تھی انھیں کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو آپ کی تعلیمات محیط لیکن یہ تعلیمات بہر حال اصولی اور دستوری نوعیت کی تھیں جن کی بنیاد پر قانون سازی کی عمارت بنائی جاسکتی تھی۔

اس دور میں فقہ اسلامی کے صرف دو ہی مآخذ ہوسکتے تھے اور یہی تھے بھی ایک تو قرآن کریم دوسرے سنت نبوی یا تشریحات نبوی قرآن حکیم بھی بنیادی طور پر کوئی قانونی یا دستوری نوعیت کی کتاب نہیں تھی جن میں مختلف دفعات کے تحت قوانین کو مرتب کیا گیا ہو بلکہ ایک صالح سوسائٹی یا معاشرہ کو جس طرح کے مسائل پیش آسکتے ہیں اور جو ضرورتیں لاحق ہوسکتی ہیں انھیں کے مطابق

آیات نازل ہوتی رہتی تھیں اور جن خطرات اور مسائل سے انھیں مستقبل میں دو چار ہونے کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔اس کے لیے تدبیروں کی نشاندہی کردی جاتی تھی دوسرا ماخذ سنت نبوی یا آپ کی تشریحات تھیں جو قرآن مجید میں بیان کئے گئے احکام کی تشریح موقع ومحل کی تعین نیز زندگی کے جزئیات میں آپ کی رہنمائی پر مشتمل تھیں۔خود قرآن مجید میں آپ کے کام کی جو نوعیت بتائی گئی ہے وہ یہ ہے۔

وھو الذی ارسل رسوله با لھدیٰ و دین الحق لیظھره علیٰ الدین کله ۲۸؎

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق لے کر بھیجا تا کہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے۔ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

ھو الذی بعث فی الامین رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتیه ویزکیھم و یُعلّمھم الکتاب والحکمۃَ وَان کانوا من قبل لفی ضلالٍ مبین ۲۹؎

ترجمہ وہی ہے جس نے امیوں میں سے خود ایک رسول انہیں میں سے اٹھایا جو انھیں اس کی آیات سناتا ہے،ان کا تزکیہ کرتا ہے اوران کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

ان آیات سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے درج ذیل مقاصد تھے۔

۱- تلاوت آیات:

یعنی قرآن مجید ہو بہو اور من وعن اُسی طرح سنانا جس طرح وہ آپ پر نازل ہوا۔

۲- تعلیم کتاب وحکمت:

یعنی نازل شدہ کتاب کی تشریح جس میں مختلف انداز سے حکمت کی تعلیم بھی شامل تھی۔

۳- تزکیۂ نفس:

اس سے مراد جماعتی زندگی کی ایسی عملی تربیت ہے جو ہر موڑ اور ہر موقف سے گذر کر اسلامی کاز کو برابر آگے بڑھاتی رہے۔ اس میں عام خیالات اخلاق و عادات، معاشرت، تمدن، سیاست غرض ہر چیز کا تزکیہ شامل ہے۔ واضح رہے کہ اس کا کوئی لگا بندھا طریقہ نہیں تھا بلکہ حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق آپ یہ فریضہ ادا کرتے رہتے تھے۔

۴- اظہار دین:

اس کا مطلب مجموعی طور سے ایک ایسی جماعت کی تیاری جو فکری اور عملی سطح پر اس دین حق کو غالب کرنے اور دیگر ادیان کو ہر محاذ اور ہر سطح پر شکست دینے کی صلاحیتوں سے لیس ہو۔

انھیں مقاصد بعثت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کرتے تھے نیز رسول اللہ ﷺ کے قول و عملی تشریحات سے استفادہ کر کے اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش بھی کرتے تھے آپ کی بیان کردہ تعلیمات کو حرز جاں بناتے تھے اور عملی لحاظ سے اسلامی کاز کے لیے اس یقین و اعتماد کے ساتھ رخصت ہوئے کہ دین کی بنیادیں ہر حیثیت سے مستحکم ہو گئیں اور قانون اسلامی کو منضبط اور مدون کرنے کا پورا خاکہ تیار ہو چکا تھا اور اس کے بعد اس کے مکمل عملی نفاذ میں کسی طرح کی علمی، عملی اور فکری رکاوٹ اور الجھن باقی نہیں رہ گئی تھی۔ غرض یہ کہ ایک اسلامی معاشرہ کی نوک پلک اور خدو خال درست کر کے ہی آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے جس کی تائید حق تعالیٰ سے بھی بایں الفاظ ہوئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا اور اسلام کو بحیثیت دین تمہارے لیے پسند کر لیا۔

غرض یہ دور فقہ اسلامی کا پہلا دور تھا جو زندگی کے جواہر کی نشو و نما دینے اور اسلامی بنیادوں کو

مضبوط کرنے کا دورہ تھا اس دور میں اگر چہ فقہ اسلامی کی ابواب اور مسائل کے لحاظ سے تدوین نہیں ہوسکی مگر آنے والے بعد کے ادوار کے لیے مسالہ یہیں سے تیار ہوا۔ اب آیئے ہم فقہ اسلامی کے دوسرے دور کے سلسلہ میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

فقہ اسلامی کا دوسرا دور:

فقہ اسلامی کا دوسرا دور عہد خلفائے راشدین یعنی نبی ﷺ کی وفات سے لے کر ۴۱ھ تک کو محیط ہے یہ دور فتوحات کی کثرت، مسائل کی وسعت اور تمدنی زندگی کی جودت سے عبارت ہے۔ اس دور میں نئے نئے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی وانفرادی مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ حالات و زمانہ کے تقاضوں نے نئی کروٹیں لیں اور نئے نئے مسائل کے سلسلہ میں طرح طرح کے زاویہ ہائے نگاہ پیدا ہو گئے ظاہر ہے ضرورتوں کا سیلاب تو بڑھتا ہی رہتا ہے۔ اس لیے قرآن وسنت کی روشنی میں ہی ان مسائل کو حل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے اس زمانہ میں قرآن وسنت کے ساتھ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر استنباط مسائل کے سلسلہ میں دو اور چیزوں کا اضافہ ہوا ایک اجماع دوسرے قیاس اور اس اضافہ کی بنیاد بھی خود قرآن وسنت میں موجود تھی۔ اجماع کے سلسلہ میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا لرسول واولی الامر منکم. [۳۰]

ترجمہ: اے لوگوں جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اولی الامر ہیں۔

دوسری جگہ اشارہوا:

ومن یشاقق الرسول من بعد ماتبین له الھدیٰ و یتبّع غیر سبیل المؤمنین نوله ماتو لیٰ ونصله جھنم. [۳۱]

ترجمہ: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری

راہ چلنے لگے تو ہم اس کو اس طرف لے جائیں گے جس طرف اس نے جانا پسند کیا اور ہم اسے جہنم میں داخل کر دیں گے۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وشاورھم فی الارض فاذا عزمت فتوکل علیٰ اللہ ان اللہ یحب المتوکلین. ۳۲

اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کیجیے پھر جب مشورہ کے بعد کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے (یعنی وہ کام کر ڈالئے) بیشک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

یہ تو رہے قرآن مجید سے اجماع کے دلائل اب آیئے سنت رسول ﷺ کی طرف اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

ان اللہ لا یجمع امتی علیٰ ضلالہ. ۳۳

یعنی اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر متفق نہ کرے گا۔

اس طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے:

مارأہ المسلمون حسناً فھو عنہ اللہ حسن .

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔

فقہاء کی اصطلاح میں اجماع کی تعریف درج ذیل ہے۔

ھو اتفاق اھل الحل والعقد من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم علیٰ أمرٍ من الامور

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اہل حل وعقد کا کسی معاملہ میں اتفاق کا نام اجماع ہے۔

بعض لوگ اجماع کے عدم وقوع اور عدم مستدل فیہ ہونے کے لیے یہ دلیل لاتے ہیں کہ

چونکہ اجماع میں امت کے تمام اہل علم کا اتفاق شرط ہے اور عملاً یہ محال اور ناممکن ہے اس لیے اجماع کا وقوع ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا جواب امام المحدثین فی الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی یوں دیتے ہیں:

''جو اجماع لوگوں کے خیال میں ہے کہ اس میں ساری امت کا اتفاق پایا جائے اور کوئی بھی اس سے الگ نہ رہے یہ خیال محال ہے اور یہ کبھی بھی واقع نہیں ہوا۔ البتہ کثیر الوقوع اجماع یہ رہا ہے کہ شہر کے مفتیوں میں سے اہل حل وعقد کا اتفاق ہو، اجماع کا یہی مفہوم ان مسائل میں پایا جاتا ہے کہ فاروق اعظمؓ کے تصریح کردہ ہیں کہ ان پر اہل حل وعقد نے اتفاق کر لیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ اجماع ہے جس میں بڑی جمعیت کا فتویٰ اور باقی لوگوں کا سکوت ہو۔ پھر وہ ہے جس میں دو مختلف قول ہوں اور تیسرے قول کی نفی پر اتفاق ہو۔ پھر اہل حرمین اور خلفاء کا اتفاق ہے۔ ۳۶

بہر حال انعقاد اجماع کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے البتہ اس کے لیے شرط اہل حل وعقد کی لگائی گئی ہے۔ نا اہلوں پر مشتمل کمیٹی کے فیصلوں کو اجماع کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

اب آیئے قیاس کی طرف سب سے پہلے اس کی تعریف ملاحظہ فرمائیں۔

قیاس کے لغوی معنیٰ اندازہ لگانا اور مساوی کرنا ہیں فقہاء کی اصطلاح میں قیاس کی تعریف درج ذیل ہے:

تقدير الفرع بالا صل فی الحكم و العلة.

یعنی حکم اور علت میں فرع کو اصل کے مطابق کرنا۔

قیاس کی ایک اور تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

الحاق امر بامر فی الحكم الشرعی لا تحاد بينهما فی العلة۔ ۳۷

یعنی دو مسئلوں میں اتحاد علت کی وجہ سے جو حکم ایک مسئلہ کا ہے وہی حکم دوسرے مسئلہ کا قرار دینا۔

قیاس کی لفظی واصطلاحی تعریف سے فارغ ہونے کے بعد اب آیئے دیکھیں کہ قیاس کے

لیے قرآن وسنت میں کیا دلائل ہیں۔قرآن مجید سے قیاس کے استعمال کی مندرجہ ذیل آیات پیش کی گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

فاعتبرو ایا اولی الا بصار پس اعتبار حاصل کرو اے آنکھ والو۔

آیت کے اس ٹکڑے میں لفظ ''اعتبار'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مفہوم فقہا نے یہ بیان کیا ہے:

الاعتبار هُوردّ الشئی الیٰ نظیره ای الحکم علی الشئی بماهو ثابت لنظیره.

یعنی کسی شئی کو اس کی نظیر کی طرف پھیرنا یعنی جو حکم اس کے نظیر کا ہے وہی اس شئی کا بھی قرار دینا۔

اسی طرح قرآن کریم میں اہل علم کے ایک خاص گروہ کا مشن تفقہ فی الدین کو قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ فرمایا:

فلو لانفرمن کل فرقة منهم طائفةليتفقهوا فی الدين. ۳۹

پس کیوں نہ گئے ہر گروہ کے لوگوں میں سے کچھ لوگ تا کہ وہ دین میں فہم وبصیرت حاصل کرتے۔

یہ آیتیں اس بات میں صریح ہیں کہ قرآن مجید میں قیاس کی بنیادیں موجود ہیں، اب آیئے سنت مبارکہ کی طرف تو یہاں اس سے زیادہ صراحت اور وضاحت کے ساتھ قیاس کی بنیادیں موجود ہیں، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیج رہے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے امتحاناً دریافت فرمایا:

بم تقضی؟ قال بما فی کتاب الله قال فان لم تجد فی کتاب الله تعالیٰ قال اقضی بمااقضیٰ بهٖ رسول الله صلی الله علیه وسلم قال فان لم تجد بماقضیٰ بهٖ رسول الله قال اجتهد برائی، قال علیه السلام الحمد لله الذی وفق رسول رسوله بمایرضیٰ بهٖ رسوله. ۴۰

جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہوگا تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ جواب دیا جیسا کتاب اللہ

میں ہے۔ آپ نے پوچھا اگر تم اسے کتاب اللہ میں نہ پاؤ گے تو کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا تو پھر میں سنت رسولؐ کے موافق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر سنت رسولؐ اللہ میں بھی اُس کی صراحت نہ ہو تو پھر؟ حضرت معاذؓ نے عرض کیا پھر میں اپنی رائے کے مطابق اجتہاد کروں گا۔ اس پر رسولؐ نے فرمایا کہ شکر ہے اس اللہ کا جس نے رسولؐ کے رسول کو اس بات کی توفیق دی جس سے اس کا رسول راضی ہے۔

ایک اور روایت میں آپؐ نے حضرت معاذؓ کے ساتھ حضرت موسیٰ اشعریؓ دونوں سے اسی طرح کا سوال کیا تھا اور آپؐ کے استفسار کے جواب میں دونوں حضرات نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ:

اذالم نجد الحکم فی السنة نقیس الامر بالامر فما کان أقرب الیٰ الحق عملنا بہ فقال علیه السلام اصبتما . [۱۴]

جب ہم سنت میں حکم نہ پائیں گے تو ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کریں گے اور جو فیصلہ ہماری سمجھ کے مطابق حق سے زیادہ قریب ہوگا ہم اس پر عمل کریں گے۔ اس پر رسول اکرمؐ نے فرمایا تم دونوں کی بات صحیح ہے۔

ظاہر ہے یہ سب انتظام اس لئے تھا کہ ہر دور کے حالات کے مطابق پیش آمد نئے نئے مسائل کے استنباط کا راستہ کھلا رہے اور اسلامی فقہ کی ہمہ گیریت اور جامعیت قائم رہے اور اس کے ماننے والے نئے پیش آمدہ مسائل سے مرعوب یا عاجز ہو کر زمانہ کا شکار نہ ہوں۔ اور اگر غور وفکر کی روح اور تعقل وتفقہ کی بنیادیں اُن سے چھین لی جائیں تو حالات وزمانہ کا وسیع جامہ شریعت کے قد پر کبھی فٹ نہ آتا اور زمانے کے تقاضے شریعت کی بنیادوں سے انسان کو محروم کر دیتے۔

بہر حال اس مرحلہ پر حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور فقہ کے دامن کو وسیع کرنے کی راہیں کھولیں اور بعد والوں کے لئے بہت سا سرمایہ جمع کر دیا۔

اس دور میں اجماع کی شکل یہ ہوئی کہ مختلف صاحب صلاحیت لوگوں پر مشتمل ایک جماعت

کی تشکیل عمل میں آئی جس میں کبار صحابہ اور اصحاب حل وعقد تھے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے صحابۂ کرام حتی الامکان مدینہ سے باہر جانے پر روک لگادی تا کہ عندالضرورہ مسائل پر اُن کی رائے معلوم کی جاسکے اور باہمی مشورت سے قانون بنانے میں ان کی مدد لی جاسکے۔ حالانکہ اس مرحلہ میں باقاعدہ طور پر فقہی اصول وکلیات تو مرتب نہ کئے جاسکے جس کی اس وقت تک کوئی ضرورت بھی نہ تھی تاہم مقاصد شریعت اور اصول دین کا لحاظ کرتے ہوئے صحابہ کرامؓ اپنی رائیں اور مشورے دیتے تھے اور اگر کسی کی رائے غور وفکر کے بعد صایب نظر نہ آتی اور دین کے اصول واجزاء پر اس کی زد پڑتی ہوئی محسوس ہوتی تو اس کو رد کردیا جاتا تھا۔

اس دور میں صحابۂ کرامؓ کے درمیان اختلافات بھی واقع ہوئے اس کے وجوہ واسباب درج ذیل تھے۔

۱- فہم قرآن میں اختلاف: اس کی مختلف نوعیتیں تھیں:

(أ) قرآن میں ایسے الفاظ کا استعمال جو ذو معنیین تھے جیسے لفظ قروء۔ جو قُرء کی جمع ہے اور اس کے معنیٰ طہر اور حیض دونوں ہی ہوتے ہیں کلام عرب میں دونوں کے لئے دلیلیں موجود تھیں اس لئے صحابہ نے ایک معنیٰ لئے اور بعض نے دوسرے۔

(ب) دو مختلف معاملات کے الگ الگ احکام اس طرح وارد ہوں کہ دونوں کے نصف اجزاء ایک دوسرے میں شامل ہوں اور دونوں کے بعض اجزاء ایک دوسرے سے متعارض بھی ہوں اس وجہ سے بھی اختلاف کا پیدا ہونا فطری تھا مثال کے طور پر جس عورت کا شوہر مرگیا ہو اس کی عدت قرآن مجید میں چار ماہ دس دن ہے اسی طرح اگر کسی حاملہ عورت کا شوہر مرے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ پہلی عدت چونکہ مطلق بیان کی گئی ہے اس لئے جس حاملہ عورت کے شوہر کا انتقال ہوجائے وہ دونوں آیتوں کے تحت آسکتی ہے یعنی ایک آیت کے تحت عدت چار ماہ دس دن ہونی چاہئے اور دوسری کے اعتبار سے وضع حمل خواہ وہ شوہر کی وفات کے بعد اسی دن ہی کیوں نہ

ہو جائے چونکہ آیت میں دونوں عدتوں کی گنجائش موجود ہے اس لئے بعض صحابہ کرامؓ کا فتویٰ پہلی آیت کے موافق تھا اور بعض کا دوسری آیت کے موافق۔

ج- موقع ومحل کی تعین کے باب میں اختلاف۔اس کی متعدد مثالیں ہیں مگر طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جاتا ہے ویسے حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کے درمیان بیشتر اختلاف کی بنیاد یہی وجہ ہے۔

۲- حدیث کے بعض پہلوؤں میں اختلاف!

(أ) حدیث کی لاعلمی:

چونکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علھیم اجمعین اجتماعی طور پر ہر وقت آپؐ کے پاس حاضر نہیں رہ سکتے تھے اس لئے یہ لازم تھا کہ کچھ حدیثیں کچھ صحابۂ کرام تک نہ پہونچی ہوں، چونکہ اس زمانہ میں نہ تو باقاعدہ روایت حدیث کا مستقل کوئی طریقہ تھا اور نہ ہی احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے تھے اور چونکہ صحابۂ کرام مختلف امصار ومدن میں سکونت اختیار کر چکے تھے ان وجوہات کی بنا پر احادیث سے لاعلمی بھی صحابۂ کرام کے درمیان اختلاف کا باعث تھی۔

(ب) قبولیت حدیث کے باب میں اختلاف!

بعض روایتیں ایسی بھی تھیں جن کے قبولیت کے باب میں صحابہ کرام کے درمیان اختلافات واقع ہوئے مثلا حدیث **ان المیت لیعذب علیٰ بکاء أهلیه**

یعنی میت کے اہل عیال کے رونے سے میت کو عذاب ہوتا ہے جب یہ حدیث حضرت عائشہؓ کو معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ تھا کہ ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا اور اس کے اہل وعیال ماتم کر رہے تھے اس پر آپؐ نے فرمایا تھا کہ میت کو عذاب ہورہا ہے اور اس کے اہل وعیال رو رہے ہیں۔اس طرح کے متعدد واقعات ہیں جو احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔

(ج) رائے کی وجہ سے اختلاف: مولانا تقی امینی صاحب فرماتے ہیں:

صحابہ کرام نے رائے کے استعمال میں مصالح، اصول دین اور فقہ کی روح کو سامنے رکھا تھا۔ قاعدہ قانون ان کے زمانہ میں زیادہ مقرر نہ ہوئے تھے۔ استحسان اور استصلاح کی صورتوں کا ثبوت بھی اُن کے یہاں ملتا ہے۔ چونکہ احکام کے موقع ومحل کو انہوں نے اپنی نظر سے دیکھا تھا اور مزاج شناسِ نبوت بن کر نظام تشریعی کو سمجھا تھا اس بناپر اُن کی رائے اور بعد والوں کی رائے میں فرق کرنا لازمی ہے پھر تمام صحابہ ایک ہی حیثیت سے مصلحت پر نظر ڈالنے کے پابند نہ تھے بلکہ مصالح پر مختلف لوگ مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے تھے جس کی بناپر فتووں میں اختلاف ناگزیر تھا۔ البتہ چونکہ اس زمانہ میں فقہ واقعاتی اور عملی تھا اس بناپر اختلاف بھی محدود تھا۔ باہمی مشورہ اور اطمینان حاصل ہوجانے کے بعد جو مسئلہ حل کیا جاتا اس میں اختلاف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔[۴۲]

اس دور میں جن مشہور ترین صحابہ کرام کو فقہ اور اس کے امور میں ماہر کہا جاسکتا ہے درج ذل اصحاب ہیں:

خلفاء اربعہ (ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین) حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابی بن کعب حضرت زید بن ثابت۔ وغیرہ ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ کرامؓ ہیں جو امور فقہیہ کے رمز شناس تھے مگر طوالت کے سبب ان کے نام حذف کئے جارہے ہیں۔

اسی مرحلہ میں یہ سانحہ بھی وقوع پذیر ہوا کہ امت مسلمہ سیاسی حیثیت سے تین فرقوں میں تقسیم ہوگئی جن کے واضح اثرات فقہ اسلامی پر بھی مرتب ہوئے۔ یہ جماعتیں تھیں۔

جمہور- اور اس سے مراد امت کا سواد اعظم تھا۔

شیعہ- اس سے مراد وہ جماعت تھی جو مسئلۂ خلافت میں تفضیل علیؓ کے قائل تھے۔

خوارج۔اس سے مراد وہ گروہ تھا جو حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی تکفیر کرتا تھا اور گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از اسلام سمجھتا تھا۔ یہ تینوں فرقے اگر چہ سیاسی بنیادوں پر جود میں آئے تھے مگر چونکہ ہر ایک مذہبی اعتبار سے اپنے آپ کو برحق تصور کرتا تھا اس لئے اُن کی اپنی با قاعدہ ایک مستقل فقہ بھی وجود میں آئی اور سیاست کی بنیادوں میں مذہب کو بھی داخل کر دیا گیا۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ برحق کونسی جماعت تھی صرف۔اس قدر بتانا مقصود ہے کہ اس دوسرے مرحلہ میں ہی فرقہ بندی کی سیاست مذہبی لبادہ اوڑھکر امت مسلمہ کی صفوں میں داخل ہوگئی جس نے حقیقی مذہب کو سخت نقصان پہونچایا۔اس کا بنیادی فائدہ اگر چہ یہ ہوا کہ فقہ اسلامی میں تنوع اور بوقلمونی کا حسن پیدا ہوا مگر بہرحال ان اختلافات نے امت مسلمہ کو ایک بڑی خلیج کی طرف ڈھکیلنے میں اہم کردار ادا کیا۔

فقہ اسلامی کا تیسرا دور:

فقہ اسلامی کے تیسرے مرحلہ کا آغاز خلافت اموی کی ابتداء یعنی ۴۱ھ سے ہوتا ہے اور دوسری صدی ہجری کے آغاز تک رہتا ہے اس دور کو بجا طور پر فقہ اسلامی کا تاسیسی دور کہا جاسکتا ہے جس میں با قاعدہ اس فن کی ترتیب وتدوین پر کام ہوا۔اس دور میں جو کام انجام پایا اس کی نوعیت درج ذیل ہے!

۱۔ صحابہ کرام کا مختلف بلاد وامصار میں سکونت اختیار کرنا:

چونکہ اس دور میں عام صحابہ وتابعین کے لئے مرکز میں وہ جاذبیت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اپنے دم پر اسلامی کار کو آگے بڑھا سکے اس لئے صحابہ کرام اور کبار تابعین نے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی اور وہ مختلف بلاد وامصار میں پھیل گئے چنانچہ ان حضرات کی عظیم الشان کوششوں اور بے لاگ محنتوں کے نتیجہ میں ایک ایسی با قاعدہ ٹیم وجود میں آئی جن پر اسلامی فقہ کے کام کو آگے بڑھانے کے معاملات میں اعتماد کیا جاسکتا تھا۔انہیں لوگوں کی محنتوں اور کوششوں کے نتیجہ میں عربوں کے علاوہ اہل عجم میں سے بھی ایک بڑی جماعت تیار ہوگئی اُن لوگوں نے بلاد عرب کے مفتوحہ علاقوں

میں تعلیم وتربیت کے مراکز قائم کئے جن سے ایسے ایسے علماء وفقہاء نکلے جن کی صلاحیت وصالحیت اہل عرب سے کسی طرح کم نہیں تھی بلکہ بعض مورخین کے اندازوں کے مطابق فقہ وروایت کے معاملہ میں عجم کا حصہ اہل عرب سے زیادہ ہے اس طرح غیر عرب مما لک کے لوگوں کو اسلامی نظامِ تشریع کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے کافی بہتر مواقع میسر آئے۔

۲- مختلف مراکز فقہیہ کا قیام:

یہ کہنا تو شاید مناسب نہ ہوگا کہ مختلف شہروں میں الگ الگ فقہی مراکز قائم کئے گئے مگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام کی کوششوں کے نتیجہ میں مختلف شہروں میں ایسے بڑے بڑے ائمہ اور فقہاء تیار ہو گئے جو عوام الناس کی توجہ کا مرکز تھے اور لوگ تشریعی امور میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے ایسے افراد کے نام ان کے شہروں کے حوالہ سے مندرجہ ذیل ہیں:

۱- مدینہ منورہ:

مدینہ منورہ کے مشہور فقیہ اور مفتی یہ ہیں صحابہ میں مشہور شخصیت یہ ہیں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوھریرہؓ تابعین میں مشہور نام یہ ہیں حضرت سعید ابن المسیبؒ، حضرت عروہ بن زبیر بن عوام، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حضرت علی بن حسین، حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن بن مسعود حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت سلیمان بن یسار، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت نافع مولی ابن عمر، حضرت ابن شہاب زہری، حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن حسین، حضرت عبداللہ بن ذکوان، حضرت یحییٰ بن سعید الانصاری، حضرت ربیعہ بن عبدالرحمان وغیرہ۔

مکہ مکرمہ:

مکہ مکرمہ کے مشاہیر فقیہ ومفتی درج ذیل ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہد بن جبیر المکی، حضرت عکرمہ، حضرت عطاء بن ابی

رباح، حضرت ابوزبیر محمد بن مسلم وغیرہ۔

کوفہ:

حضرت علقمہ بن قیس النخعی ، حضرت مسروق بن اجدع، حضرت عبیدہ بن عمر السلمان، حضرت اسود بن یزید النخعی ، حضرت شرع بن حارث کندی حضرت ابراہیم بن یزید النخعی ، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عامر بن شرجیل، وغیرہ۔

بصرہ وشام:

بصری فقہاء۔ حضرت انس بن مالک الانصاریؓ، حضرت ابوالعالیہ، حضرت ابوالشعشاء جابر بن زید، حضرت محمد بن سیریں، حضرت حسن بن ابی الحسن یسار، حضرت قتادہ، بن دعامہ السدوسی وغیرہ۔

شامی فقہاء کے نام یہ ہیں:

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم الاشعری، حضرت ابوادریس الخولانی، حضرت قبیصہ بن ذویب، حضرت مکحول بن ابومسلم، حضرت رجاء بن حیوہ الکندی، حضرت عمر بن عبدالعزیز بن مروان۔

مصرویمن:

مصر کے فقہاء حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ حضرت ابوالخیر مرثد عبداللہ، حضرت یزید بن حبیب۔

یمن کے فقہاء۔ حضرت طاؤس بن کیسان الجندی، حضرت وہب بن منبہ حضرت یحیٰی بن ابی کثیر وغیرہ۔

۳۔ تدوین حدیث کا آغاز:

اسی دور میں تدوین حدیث کا باقاعدہ آغاز ہوا، اس کی ابتداء اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس خط سے ہوئی جو انہوں نے اسلامی بلاد وامصار میں موجود علماء اور محدثین کے نام لکھا تھا۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

رسولؐ اللہ کی حدیثیں تلاش کر کے انہیں جمع کرو کیونکہ مجھے علم اور علماء کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔[۴۴]

پھر حضرت ابوبکر بن حزم اور حضرت ابن شہاب الزہری کے اہتمام سے اس کا باضابطہ آغاز ہوا۔ اگرچہ کہ حدیث کی تدوین کا بے ضابطہ کام عہد رسولؐ سے ہی جاری تھا اور آپؐ نے کچھ دستاویزات اپنے اصحاب کو خود لکھوائی تھیں اور بعض صحیفے صحابۂ کرامؓ نے اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے جیسے حضرت عبداللہ بن عمرو کا لکھا ہوا صحیفہ ''الصادقہ'' یا جیسے ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' جو مشہور محقق ڈاکٹر حمیداللہ صاحب کی تحقیق سے شائع بھی ہو چکا ہے۔

اگرچہ یہ ابتدائی تدوین بہت جامع نہیں تھی اور مختلف ابواب اور عناوین کے تحت حدیثیں اس طرح جمع نہیں کی گئی تھیں جو بعد میں ائمہ حدیث کے ہاتھوں انجام پائیں مگر ظاہر ہے کہ ہر کام کے آغاز میں فطری طور پر وہ پختگی نہیں ہوئی جو بعد میں ہوتی ہے اس لئے تدوین حدیث کی جامعیت اور تکمیل کا سہرا بعد کی صدیوں کے محدثین کے سر ہے مگر باقاعدہ آغاز کا مرحلہ اموی دور حکومت میں ہوا۔

۴- رائے اور روایت کو استعمال کرنے کی حد میں اختلاف:

چونکہ اس دور تک باقاعدہ احادیث نبوی کی تدوین نہ ہو سکی تھی اس لئے جملہ احادیث تک رسائی کا دعویٰ کوئی بھی محدث یا فقیہ نہیں کر سکتا تھا۔ اختلاف یہاں سے شروع ہوا کہ پیش آمدہ صورت حال میں اگر حدیث نہ مل سکے تو کیا کیا جائے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہمیں موجودہ احادیث کو پیش نظر رکھ کر فتویٰ دینا چاہیئے۔ دوسرا گروہ شریعت کو عقلی اور اصولی معیار سے دیکھتا تھا اور حدیث نہ ملنے کی صورت میں رائے کا استعمال کرتا تھا اس بنا پر یہ گروہ اہل الرائے کہلایا پہلے گروہ کی نمائندگی اہل حجاز کرتے تھے جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا جبکہ دوسرے گروہ کی نمائندگی اہل عراق کرتے تھے جس مرکز کوفہ تھا اور غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ اہل حجاز کو حدیث کی واقفیت اور

پہونچ میں دوسری کسی بھی جگہ کے علماء کے مقابلہ میں زیادہ سبقت حاصل تھی کیونکہ صحابہؓ کرامؓ کا ایک بڑا گروہ اب بھی حجاز بالخصوص مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھا۔ البتہ بعد کے ادوار میں صحابہؓ کرام کے مختلف بلاد وامصار میں پھیل جانے کے بعد حجازیوں کو بھی براہ راست وہ سہولتیں حاصل نہ رہ سکیں جس کی وجہ سے اُن کو دوسرے اقطار وامصار کے علماء پر فضیلت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں پہلے کے مقابلہ میں چونکہ تمدنی مسائل کی کثرت اور احوال ومعاملات کو گوناگونی نیز بیرونی اثرات کی آمیزش سے فقہ وشریعت کے دائرے وسیع ہوتے گئے اس لئے رائے کا استعمال ناگزیر ہوا اور اسی بنا پر فقہی آراء کا اختلاف بھی سامنے آیا جو فطری تھا۔

چنانچہ اس دور میں مختلف فقہی اصطلاحات مثلاً قیاس استحسان اور استصلاح وغیرہ کا استعمال کثرت سے ہوا- ظاہر ہے یہ ترقی پذیر معاشرے کی ضرورتوں کے عین مطابق تھا مگر پہلے گروہ کے بعض حضرات نے اس کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ معاشرتی اور قومی ضرورتوں سے کب تک آنکھیں بند رکھی جاسکتی تھیں لہٰذا بعد میں افہام واستفہام کا دور بھی شروع اور بعد کے لوگوں میں باہمی افادہ واستفادہ کا بھی آغاز ہوا مگر بعض شدت پسندوں کی مجموعی صورت حال اس وقت بھی کچھ زیادہ بہتر نہ ہوسکی اور زمیں جنبد زماں جنبد نہ جنبد گل محمد کے مصداق وہ اپنی روش پر قائم رہے مگر زمانہ کا مفتی اُن کو نظر انداز کرتا ہوا وہیں پہونچا جہاں لوگوں نے اس کے مسائل کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پیش آمدہ مسائل کے چیلنجز کو قبول کرلیا اور نصوص شریعت کی عبارت، اشارت اور دلالت وغیرہ کے ذریعہ انہیں حل کیا۔

۵- وضع حدیث کا آغاز:

جہاں ایک طرف اس دور میں تدوین حدیث کا باقاعدہ آغاز ہوا وہیں دوسری طرف جھوٹی حدیثوں کی روایت کا سلسلہ بھی شروع ہوا جس کا اس دور کے فقہی علم کلام پر بھی اثر انداز ہونا ناگزیر تھا مگر اللہ رب العزت کے فضل وکرم سے محدثین کی جماعت نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور اس

کے نتیجہ میں حفاظت حدیث کے سلسلہ میں بہت سارے علوم ایجاد ہوئے جس کی وجہ سے فتنۂ وضع حدیث بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا اور جھوٹ کی پودا کھڑ کر رہی۔ اس فتنہ سے مقابلہ کے لئے محدثین نے جن علوم کی داغ بیل ڈالی ان میں سے کچھ یہ ہیں، علم اسناد، علم جرح وتعدیل، علم مصطلحات حدیث وغیرہ اور پھر ان علوم کی کئی شاخیں ہوئیں مزید برآں روایت حدیث کے اصول وضع کئے گئے۔ جھوٹی روایتوں کے رواج کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کے وجوہ واسباب درج ذیل تھے۔

۱- بد دین اور فاسق و فاجر قسم کے لوگ دین کی تحقیر کے جذبہ سے حدیثیں وضع کرتے تھے۔

۲- جاہل صوفی اور عبادت گزار قسم کے لوگ عوام الناس کو دین کی طرف راغب کرنے کے لئے ترغیب وترہیب اور فضائل سے متعلق حدیثیں وضع کرتے تھے۔

۳- کم ظرف اور بے استعداد لوگ محدثانہ شہرت حاصل کرنے کے لئے احادیث وضع کرتے تھے۔

۴- بعض لوگ حکام وامراء نیز اہل دنیا کو خوش کرنے کے لئے ان کے کاموں پر شرعی دلیل قائم کرنے کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے۔

۵- مختلف بدعتی فرقوں کے متبعین اپنے اپنے مسلک پر دلائل قائم کرنے کے لئے بھی حدیثیں وضع کرتے تھے۔

۶- بعض لوگ ضعیف اور کمزور متن کے لئے صحیح اور مشہور سند گھڑتے اور بعض سندوں کو الٹ پلٹ کر اس میں ترمیم کر دیتے تھے جس کا مقصد اپنی کمزور بات کے لئے تقویت فراہم کرنا اور اپنی علمی بلندی تسلیم کرانا ہوتا تھا۔

۷- بعض لوگوں صحابہ کرامؓ کے اقوال، اہل عرب کے مقولے اور حکماء کے حکمت آمیز قصوں کو بھی رسول اللہؐ کی طرف منسوب کر کے حدیث بنا دیا تھا۔

یہ وجوہ واسباب تھے جن کی وجہ سے محدثین کرام نے تدوین حدیث کا نہایت اہم مورچہ سنبھالا اور صحیح و سچی احادیث کو جھوٹی روایات وحکایات سے پاک کر کے ہی دم لیا۔ شریعت کے باب میں یہ ان کا زبردست کارنامہ تھا انہیں کی زبردست کوششوں کے نتیجہ میں آج یہ بے غبار شریعت ہمارے سامنے ہے۔

مجموعی طور پر یہ مرحلہ فقہ کا تاسیسی مرحلہ تھا جو بعد کے مرحلہ کے لئے ایک بنیاد اور اصل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس نے بعد کے مراحل کے لئے کام بہت آسان کر دیا۔

فقہ اسلامی کا چوتھا مرحلہ

فقہ اسلامی کا چوتھا دور دراصل تیسرے دور کی توسیع یا تمہید ہے۔ اس دور میں اس فن کو ضبط واستحکام نصیب ہوا۔ اس دور کو فقہ اسلامی کا دور عروج وارتقاء کہا جا سکتا ہے اسی دور میں فقہی مذاہب کے بڑے بڑے اسکول وجود میں آئے اور اس فن کے اصول وقواعد مرتب ہوئے اور تمدن کی وسعت اور فتوحات کی کثرت نیز دوسری تہذیبوں کا اسلامی تہذیب سے براہ راست مقابلہ شروع ہوا اور چونکہ اس کا مسالہ اور گارہ تیسرے دور میں تیار ہو چکا تھا اس لئے فقہ اسلامی نے اس دور میں پوری شان کے ساتھ اپنے جلوے دکھائے اور ہر محاذ اور ہر مقام پر اپنی تفوق و برتری کے جھنڈے گاڑ دیئے اور اسلامی تہذیب وثقافت کا امتیاز ثابت ہو کر رہا اس دور کی چند اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- تدوین حدیث کا کام انجام کو پہونچا:

تدوین حدیث کا سرکاری طور پر باضابطہ آغاز اگرچہ خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ ہی سے ہو گیا تھا مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس دور میں صرف جمع وتدوین کا کام ہوا تھا مثلاً نماز روزہ وغیرہ کی حدیثوں کو سلسلہ وار جوڑ دیا جاتا تھا نیز حدیث رسول کے ساتھ صحابہ وتابعین کے اقوال کو مخلوط کر دیا جاتا تھا اگرچہ یہ رعایت ضرور کی جاتی تھی کی حدیثوں کی نسبت نبی کریمؐ کی طرف اور صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال کی نسبت انہیں کی طرف کی جاتی۔ مگر بعد کے مرحلہ میں اقوال واحادیث کو الگ الگ نقل کیا گیا ساتھ ہی حدیثوں کی تبویب وترتیب کا بھی اہتمام کیا گیا اور اس کا بھی لحاظ کیا گیا کہ ایک راوی سے مروی تمام احادیث کا ذخیرہ الگ الگ کتابوں کی شکل میں مرتب کیا گیا جنہیں مسانید کا نام دیا گیا مثلاً مسند ابوبکر الصدیق جس

میں حضرت ابوبکرؓ سے مروی تمام احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس مرحلہ میں ایک اور مہتم بالشان کام جو کیا گیا وہ احادیث کی چھان پھٹک اور صحیح وضعیف کا امتیاز تھا محدثین نے نہایت محنت اور عرق ریزی کے ساتھ احادیث کے ایسے مجموعے مرتب کئے جن کی صحت پر اصول وقواعد کی روشنی میں امت مسلمہ کا اتفاق ہو گیا اس گروہ کے سرخیل محدث اعظم حضرت محمد بن اسماعیل البخاری اور مسلم بن حجاج القشیری نیشاپوری ہیں پھر انہی کے نہج پر دوسرے ائمہ حدیث مثلاً ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمھم اللہ نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کئے جو مذکورہ دونوں بزرگوں کے مرتبہ تک گو نہ پہونچ سکے مگر بہرحال صحاح کے مجموعی مرتبہ تک ان کا بھی شمار ہوا۔ ان کے علاوہ بھی بعض بزرگوں نے حدیث کے مجموعے مرتب کئے جو نہایت شکریہ اور اہتمام کے مستحق ہوئے۔

۲- جرح وتعدیل کا فن اسی دور میں مرتب ہوا:

راویان حدیث کے حالات کی چھان بین اور اُن کے اخلاقی حالات، حافظہ، سمجھ بوجھ، امانت ودیانت وغیرہ کے علم کا نام جرح وتعدیل ہے۔ اس فن کا آغاز اور راویوں کی توثیق وتجریح کا کام ویسے تو صغار صحابہ کے زمانہ ہی سے شروع ہو گیا تھا جن کے خاص خاص نام یہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ (م ۶۸ھ) حضرت عبادہ بن الصابت (م ۳۴ھ) حضرت انس بن مالکؓ (م ۹۳ھ) وغیرہ۔

تابعین یں اہم نام یہ ہیں:

سعید بن المسیبؒ (م ۹۳ھ) امام شعبیؒ (م ۱۰۴ھ) امام ابن سیرینؒ (م ۱۱۰ھ) امام اعمشؒ (م ۱۴۸ھ) وغیرہم۔

اس کے بعد محدثین کی ایک پوری جماعت ہے جنہوں نے اس فن میں مہارت حاصل کی اور کتابیں مرتب کیں۔ مثلاً، شعبہ بن الحجاج الغتکی، امام مالک بن انس، معمر، ھشام الدستوائی، اوزاعی، ثوری، حماد بن سلمہ، لیث بن سعد، عبداللہ بن مبارک، سفیان بن عُیینہ، وکیع بن الجراح، یحیٰ

بن سعید انقطان اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ وغیرہم اس فن میں جن لوگوں نے تصنیف وتالیف نیز بحث وگفتگو کا آغاز کیا ان میں مندرجہ ذیل حضرات سرفہرست ہیں۔

یحیٰ بن معینؒ، احمد بن حنبلؒ، محمد بن سعدؒ کاتب الواقدی، علی بن المدینیؒ، امام بخاری، امام مسلم، ابوزرعہ الدمشقی، ابوحاتم الرازی اور امام ابوداؤد السجستانی وغیرہم۔ بہرحال اسی مرحلہ میں یہ فن بھی پایۂ تکمیل کو پہونچا اور اگرچہ اس فن میں کام نویں صدی ہجری کے اواخر تک ہوا مگر بنیادی طور پر یہ فن اسی دور میں پایۂ تکمیل تک پہونچا چکا تھا بعد کے دور میں اس کی تہذیب وتحسین کی گئی۔[۴۵]

۳- اصول فقہ کی تدوین اور مآخذ فقہ کے باب میں اختلاف:

اس دور کی ایک اہم خصوصیت اصول فقہ کی تدوین بھی ہے۔ اسی زمانہ کے فقہاء نے اصول فقہ پر بہت سی کتابیں لکھیں اور نہایت کامیاب طریقہ سے اس فن کو مدون کیا جس سے بعد کے لوگوں کو رہبری حاصل ہوئی اور انہیں اصولوں کو بنیاد بنا کر مسائل کا استنباط واستخراج بھی ہوا نیز قرآن وسنت کے اسلوب بیان اور مطالب وغیرہ پر نظر کر کے فرض، واجب، سنت، مستحب، مندوب حرام، مکروہ وغیرہ کہ اصطلاحیں مقرر کی گئیں۔

ظاہر ہے قرآن وحدیث کے مآخذ فقہ ہونے پر تو کوئی اختلاف نہ تھا مگر ان مآخذ کی تفصیلات میں کچھ اختلاف ضرور رہا بالخصوص قیاس کے مآخذ ہونے میں حدیث کی حجیت کے باب میں معتزلہ کا اختلاف ضرور سامنے آیا مگر جمہور فقہاء سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ فقہاء امت بالخصوص امام شافعیؒ نے اس فتنہ کا زبردست مقابلہ کیا اور اس فتنہ کو اٹھنے سے پہلے ہی اسے تہہ نشیں کر دیا گیا اور کوئی قابل ذکر گروہ اس کی تائید میں آگے نہ آیا البتہ قبولیت سنت کے طریقہ میں ضرور اختلاف ہوا اور ہر فقیہ نے اپنے اپنے معیار کے مطابق اس کے ضابطے اور طریقے مقرر کئے۔

قیاس واستحسان کے باب میں زیادہ اختلاف ہوا محدثین نے قیاس کے استعمال پر پابندی لگانے کی کوشش کی، امام شافعی نے استحسان کی تردید کی حالانکہ اس کے عملی استعمال سے وہ بھی

اپنا دامن نہ بچا سکے اسی طرح امام داؤد ظاہری اور ان کے متبعین نے بھی نہایت شدت سے اس کا انکار کیا۔ اس میں شک نہیں کہ قیاس اور رائے سے اُس زمانہ میں بہت کام لیا گیا بالخصوص احناف کا حصہ اس میں زیادہ ہے۔ دوسرے گروہ فقہاء یعنی حنابلہ مالکیہ اور شوافع کا حصہ نسبتاً کم ہے۔ اسی طرح اجماع کی شرطوں میں بھی اختلاف ہوا جس کی بنا پر اثبات مسائل میں مختلف زاویہ ہائے نظر پیدا ہوئے۔

اسی طرح حکم کے ثبوت کے درجہ اور طریقہ میں بھی اختلاف ہوا مثلاً کسی طرح وجوبی حکم ثابت ہوتا ہے اور کس طرح غیر وجوبی حکم ثابت ہوتا ہے۔ فقہاء نے نہایت ضبط و تحقیق اور تلاش و تفحص کے بعد اس کے اصول و قواعد مرتب کئے۔

۴- مشہور مذاہب فقہیہ اسی دور میں وجود میں آئے:

اس دور کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسی دور میں فقہ کے مشہور مذاہب اربعہ وجود میں آئے۔ جن کی تھوڑی سی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- فقہ حنفی:

اس کی بانی مشہور فقیہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (۸۰-۱۵۰ھ) ہیں۔ انہیں امام اعظم بھی کہا جاتا ہے انہیں کے نام سے یہ فقہی اسکول موسوم ہوا اگرچہ فقہ حنفی کے تمام مسائل کا انتساب حضرت امام ابوحنیفہؒ کی طرف کیا جاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ فقہ حنفی کے بہت سارے مفتیٰ بہ اقوال ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کی طرف منسوب ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں درج ذیل حضرات کو خصوصی شہرت نصیب ہوئی۔

۱- امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاریؒ (۱۱۳ھ-۱۸۳ھ)

۲- امام محمد بن حسن بن فرقد الشیبانیؒ (۱۳۲ھ-۱۸۹ھ)

۳- امام زفر بن ہذیل بن قیس الکوفیؒ (۱۱۰ھ-۱۵۸ھ)

۴- امام حسن بن زیاد لولوئی الکوفیؒ (م ۲۰۴ھ)

۲- فقہ مالکی:

اس مکتب فقہیہ کے بانی امام مالک بن انس بن ابی عامر المدنیؒ (۹۳ھ-م۱۷۹ھ) ہیں۔ امام مالک، بیک وقت محدث اور فقیہ دونوں تھے اور محدثین اور فقہاء دونوں گروہوں میں اُن کے شاگرد موجود ہیں۔ اصول فقہ میں ''مصالح مرسلہ'' کے استعمال کے معاملہ میں امام مالک کا حصہ زیادہ ہے اور اس میں اس حد تک وسعت سے کام لیا ہے کہ موقع ومحل کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے حدود وقیود کی پابندی بھی نہیں کی ہے اسی وجہ سے یہ اصول انہیں کی جانب منسوب کیا گیا ہے، ورنہ اس کی نفس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ اس سلسلہ میں یہاں امام مالکؒ کے دلائل بیان کرنا تطویل کے سوا کچھ بھی نہیں اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

۳- فقہ شافعی:

اس فقہی اسکول کے بانی امام محمد بن ادریش الشافعی۔ القرشیؒ (۱۵۰-۲۰۴ھ) ہیںؒ۔ آپ امام شافعی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ رائے اور قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دینا آپ کا خاص وصف وامتیاز ہے آپ کے شاگرد مصر، عراق اور جنوبی ہندوستان کے بعض حصوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

۴- فقہ حنبلی:

آپ کا پورا نام احمد بن حنبل بن ھلالی الشیبانیؒ ہے (۱۶۴-م۲۴۱ھ) آپ بھی بیک وقت فقیہ اور محدث دونوں ہی تھے آپ کی مرتب کردہ سند الام احمد بن حنبل نہایت مشہور ہے اور علم حدیث کے نہایت اہم اوصاف وخصوصیات کی حامل ہے آپ کے ماننے والے نجد وحجاز میں زیادہ ہیں۔ ان چاروں فقہی اسکولوں کی شہرت اور قبولیت عامہ کے اسباب ووجوہ درج ذیل ہیں:

۱- ان کی تمام رائیں جمع وترتیب کے مرحلہ سے گزریں جبکہ دوسرے ائمہ فقہ کو یہ امتیاز نہ حاصل ہوسکا۔

۲- ان تمام حضرات کے شاگردوں کو سوسائٹی میں بہت اونچا مقام ومرتبہ حاصل ہوا جس کی بنا پر جب یہ حضرات ابتدا سے اساتذہ کا حوالہ دیتے تھے تو ان کی رایوں کو نہایت وقعت اور مرتبہ ملتا تھا۔

۳- شاگردوں نے ان کی رائے کی اشاعت وحمایت میں کافی زور لگایا۔

۴- یہ مسالک اپنی وسعت کے لحاظ سے زمانہ کی ضرورتوں کے اس قدر مطابق تھے کہ حکومتوں نے انہیں اپنا قانون بنالیا جس کی وجہ سے انہیں خوب پذیرائی حاصل ہوئی، ان چار فقہی مذاہب کے علاوہ اور کئی دیگر ائمہ فقہ بھی اس زمانہ میں پیدا ہوئے اوران کے ماننے والے بھی تھے مگر بدقسمتی سے اُن مذاہب کو وہ شہرت ومقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو مندرجہ بالا چاروں فقہی مذاہب کو حاصل ہوئی اس لئے اور آہستہ آہستہ یہ مذاہب ختم ہوگئے۔ان مذاہب کے بانیوں میں سے چند مشہور نام یہ ہیں۔

۱- ابوعبدالرحمٰن بن محمد الاوزاعیؒ (۸۸-م۱۵۷) اوزاع یمنی قبیلہ ذی الکلاع کی ایک شاخ تھی۔امام اوزاعی اُن محدثین میں سے تھے جو قیاس کو پسند نہیں کرتے تھے۔وہ شام کے قاضی تھے۔ پھر بنی امیہ کی اولادوں میں جو لوگ اندلس گئے ان کے ساتھ امام اوزاعیؒ کا مسلک بھی اندلس گیا۔ پھر تیسری صدی کے نصف حصہ میں امام شافعیؒ کے مذہب کے مقابلہ میں شام میں اور امام مالک کے مذہب کے مقابلہ میں اندلس میں اس مذہب کا چراغ بجھ گیا۔

۲- **ابوسلیمان دائودبن علی بن خلف الاصفہانی المعروف بدائود الظاھری** (۲۰۲ھم۲۴۳ھ) آپ کوفہ میں پیدا ہوئے۔آپ کو ظاہری کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت کے ظاہر پر عمل کرتے تھے اور وہ اسے اس وقت تک نہ چھوڑتے تھے جب تک کتاب وسنت کی کسی دلیل یا اجماع سے یہ ثابت نہ ہوجائے کہ ظاہر کتاب وسنت مراد نہیں ہے۔کتاب وسنت میں مسئلہ نہ ملنے پر اجماع پر عمل پیرا ہوتے قیاس کی اُن کے یہاں بالکل گنجائش نہیں تھی ان کا قول ہے کہ کتاب وسنت کے عموم سے ہر مسئلہ کا حل نکل آتا ہے اس موضوع پر اُن کی کتاب ''البطال

لقیاس‘‘ ان کے موقف کو واضح کرتی ہے۔ پانچویں صدی کے نصف حصہ تک ان کے مذہب کے متبعین تھے مگر اس کے بعد اس مذہب کا بھی چراغ گل ہوگیا۔ بہت سے مسائل میں امام داؤد ظاہری کی رائے جمہور کے خلاف ہے ان کے مسلک کی مشہور کتاب المحلٰی ہے جے ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم لاندلسیؒ (م ۴۵۲ھ) مرتب کی ہے۔

۳- ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبریؒ (۲۲۴ھ) آپ طبرستان میں پیدا ہوئے، جو علاقۂ رے میں واقع ہے آپ کی تفسیر اور تاریخ بہت مشہور ہیں اور آج بھی اہل علم کا مرجع ہیں ان کے علاوہ بھی متعدد کتابیں آپ نے تصنیف فرمائیں ان کی ایک کتاب کا نام لطیف القول ہے۔ اس کتاب میں وہ اقوال درج ہیں جن کو انہوں نے منتخب کیا ہے اس کے علاوہ فقہ میں اُن کی ایک کتاب الخفیف ہے جس کو انہوں نے وزیر مکتفی باللہ کی فرمائش پر لکھا ہے۔ یہ مذہب پانچویں صدی ہجری کے نصف تک مشہور و معمول رہا۔

اس کے علاوہ اس دور میں شیعہ فرقہ کے دو ر مشہور فقہی اسکول وجود میں آئے جن میں ایک کا نام شیعہ زیدیہ ہے دوسرے کا شیعہ امامیہ۔

۱- **شیعہ زیدیہ:**

فرقہ زیدیہ زید بن علی بن حسین کی طرف منسوب ہے اس کے اماموں میں اجتہاد کی شرط ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بکثرت امام اصحاب الرائے پیدا ہوئے ان میں سے مشہور یہ ہیں:

۱- حسن بن علی بن حسن زیدؒ

۲- حسن بن زید بن محمدؒ

۳- قاسم بن ابراہیمؒ

۴- ہادی یحیٰ بن الحسن بن القاسمؒ

۲- شیعہ امامیہ:

اس فرقہ کے سب سے بڑے امام ابوعبداللہ جعفر الصادق تھے۔ اس فرقہ کی بنیاد اس بات پر تھی کہ امام معصوم ہوتے ہیں اور حضرت علیؓ رسولؐ کے وصی تھے۔

ان مذاہب کے علاوہ اور بھی بے شمار ائمہ ہیں جن کو درجۂ استناد حاصل تھا مگر انہیں تبعین میسر نہ آئے اس لئے اُن کے مذاہب کی اشاعت نہ ہوسکی مثلاً امام لیث بن سعد جو اہل مصر کے امام تھے اور جن کے بارے میں امام شافعیؒ کا قول ہے کہ وہ امام مالک سے بڑے فقیہ ہیں مگر بدقسمتی سے اُن کو ایسے شاگرد میسر نہ آسکے جو اُن کے لئے شہرت دوام کا سبب بنتے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے ائمۂ مجتہدین ہیں جو اسی مقام و مرتبہ کے حامل تھے مگر اُن کے استقصاء کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔

خلاصہ یہ کہ یہ دور دورِ اجتہاد تھا۔ اس میں تقلید کا اثر بالکل نہ تھ۔ یہی وجہ ہے، کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور کے تلامذہ نہ صرف اپنے استاد کی رائے سے بدلائل اختلاف کرتے تھے بلکہ ان کی باتیں تسلیم بھی کی جاتی تھیں لیکن بدقسمتی سے بعد کے ادوار میں اجتہاد کی مذکورہ روح باقی نہ رہی اور آہستہ آہستہ کم ہمتی اور بے سوادی کا یہ عالم ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ ہی بند ہوگیا۔ ۴۶

مگر اس کے وجوہ واسباب اور اثرات ونتائج پر علیحدہ ایک فصل درکار ہے جس کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش اس لئے فی الحال ہم فقہ اسلامی کے اس پانچویں اور آخری مرحلہ کا تذکرہ کریں گے جو اس فصل کا آخری مقام ہے۔

فقہ اسلامی کا پانچواں مرحلہ:

فقہ اسلامی کا پانچواں مرحلہ چوتھی صدی کے نصف اول سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا حالانکہ آغاز اسلام سے لیکر مذکورہ صدی تک اجتہاد کے سلسلہ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان اجتہاد شرعی ایک امر مسلم کی

طرح تھا۔ اور پیش آمدہ احوال و مسائل کے سلسلہ میں صحابہ کرام برابر اجتہاد کرتے تھے بالخصوص وہ صحابہ جو عہدۂ قضا کے منصب پر متمکن تھے وہ اپنے فیصلوں میں عموماً اجتہاد سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ عہد صحابۂ کرامؓ میں اجتہاد مطلق ایک عام معلوم اور مسلمہ حقیقت تھی۔ یہی حال تابعین، تبع تابعین اور عصر ائمۂ مجتہدین تک رہا تا آنکہ تیسری صدی کے نصف آخر تک پہونچتے پہونچتے یہ خیال عام ہوگیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا اور مسلمانوں کے لئے اجتہاد مطلق حرام ٹھہرا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا قرآن کریم میں یہ صاف ارشاد موجود تھا کہ:

واذا جاء هم أمر من الامن اوالخوف اذاعوابه ولوردوه الىٰ الرسول والىٰ أُولى الامر منهم لعلمة الذين يستنبطونه منهم. ولولا فضل الله عليكم ورحمته لاتبعتم الشيطان الاقليلا. (۴۷النساء آیت ۸۳)

اور جب انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملتی ہے تو وہ (بے سوچے سمجھے) اُس کی تشہیر شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اگر اسے پہلے رسول اور اپنے میں سے اصحاب فہم کی طرف لے جاتے تو وہ لوگ بات کی تہہ کو پہونچ جاتے جو نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور گر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو معدودے چند کے سوا تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔

بہرحال یہ صورت حال چوتھی صدی ہجری میں عام ہوگئی۔ چنانچہ ابو حامد الغزالی جو فقہائے شافعیہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔

ومن ليس له رتبة الاجتهاد وهو حكم اهل العصر انمايفتي فيمايسال عنداعن صاحب مذهبه فلوظهر له ضعف مذهبه لم يجزله ان يتركه وليس له ان يفتي بغيره وماأشكل عليه يلزمه ان يقول لعل عندصاحبي جواباً عن هذافأني لستُ مستقلاجالاجتهاد فى اصول الشرع۔ [۴۸]

اور وہ شخص جسے رتبۂ اجتہاد حاصل نہیں اور وہ اہل زمانہ کا حکم ہو تو وہ صرف وہی فتویٰ دے گا جو اس کے مذہب کے مطابق ہو اور اگر اُسے اپنا مذہب اس مسئلہ میں ضعیف لگے تو بھی اس کے لئے اس کا چھوڑنا جائز نہ ہوگا اور دوسرے مذہب کے مطابق (خواہ وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو) اسے فتویٰ دینا جائز نہ ہوگا۔ اور جس مسئلہ کے سلسلہ میں وہ مشکل میں پڑ جائے تو اس سلسلہ میں اسے یہ کہنا چاہئے کہ شاید ہمارے مذہب کے دوسرے ساتھیوں کے پاس اس مشکل کا جواب ہو کیونکہ میں اصول شرع میں اجتہاد مطلق کے درجہ پر فائز نہیں ہوں۔

اسی طرح رافعی جو علمائے شافعیہ میں سے ہیں فرماتے ہیں:

''خلق خدا کا گویا اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ آج کے زمانہ میں کسی مجتہد کا وجود ہی نہیں ہے''۴۹

اسی طرح صاحب الخلاصہ جو حنفی مسلک فکر سے تعلق رکھتے ہیں فرماتے ہیں:

ان القاضی اذا قاس مسئلة علىٰ اخرىٰ وحكم فظهر أن الحق بخلافة فالمحكوم عليه يخاصم يوم القيامة القاضی والمحكوم له لأن القاضی قدأثم بالاجتهاد لأنه لاأهل للاجتهاد فی زماننا والمحكوم له أثم بأخذ المال۵۰

قاضی اگر کسی مسئلہ کو دوسرے مسئلہ پر قیاس کرتا ہے اور پھر فیصلہ کرتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیصلہ اس کے خلاف ہے جو اس نے کیا ہے تو جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہے وہ قیامت کے دن قاضی اور جس کے حق میں قاضی نے فیصلہ کیا ہے دونوں کا دامن گیر ہوگا۔ قاضی کا اس لئے کہ اس نے اجتہاد کر کے گناہ کیا کیونکہ آج ہمارے زمانہ میں اجتہاد کا اہل کوئی ہے ہی نہیں اور جس کے حق میں فیصلہ ہوا اس کا دامن اس لئے پکڑے گا کیونکہ وہ اس کا مال لے کر گناہ گار رہوا۔

بہر حال یہ موقف اس قدر عام ہوا کہ علماء کرام اور فقہائے عظام اجتہاد و استنباط اور استدلال و استخراج مسئلہ سے بے نیاز ہو گئے اور اپنے اپنے مسلک پر مضبوطی سے گامزن ہو گئے اب انہیں اس

بات کی قطعاً پرواہ نہیں رہی کہ نفس مسئلہ میں ان کے مذہب کے دلائل مضبوط ہیں یا کمزور اب وہ مقلد محض بن کے رہ گئے۔

لیکن اس دور میں فقہ میں جو کام ہوا اس کی نوعیت بھی بیان کرنا ضروری ہے۔مندرجہ ذیل چیزیں اس عہد کا وصف خاص ہیں۔

۱- ظہور تقلید

یہ دور دراصل فقہ کا عہد زوال ہے۔اور اس علمی زوال کو بنی عباس کے سیاسی زوال سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔یعنی وہ بلندی جو ائمۃ اربعہ کے عہد میں قائم تھی اور جس نے انہیں یہ کہنا سکھایا تھا کہ کل یوخذ و یرد الا صاحب ھذا القبر یعنی رسول اللہؐ کے سوا کوئی ایسا فرد بشر نہیں جس کے قول کو رد وقبول کے دائرہ میں نہ رکھا جائے یا جیسے یہ قول کہ ھوء لاء رجال ونحن رجال یعنی وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں اگر انہیں اجتہاد کا حق حاصل تھا تو ہمیں بھی اس کا حق حاصل ہے۔اب یہ اولوالعزمی اور علمی شعور و پختگی تقریباً ختم ہوگئی بس اس کا ایک ضعیف سا اثر باقی رہا۔البتہ روح تقلید پوری طرح حاوی ہوگئی۔ یہاں تقلید سے ہماری مراد یہ ہے کہ ایک معین امام کے احکام کا اتباع اس طرح کیا جائے گا گویا وہ شارع کے احکام ہیں جن کی پیروی مقلد پر لازم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ گذشتہ ادوار میں بھی مجتہدین اور مقلدین موجود تھے۔مجتہد وہ فقہاء تھے جو کتاب اور سنت کو پڑھتے تھے اور اُن کو ظواہر نصوص یا نصوص معقولہ سے استنباط واستخراج کی قدرت حاصل تھی اور مقلدین وہ تھے جنہوں نے کتاب وسنت کو اس طور سے نہیں پڑھا تھا جو ان کو استنباط کا اہل بنا سکے اس لئے جب اُن کے پاس کوئی مسئلہ آتا جو اُن کی فقہ کی کتابوں میں مرقوم نہ ہوتا تو وہ اسے اپنے شہر کے فقہاء میں سے کسی بھی فقیہ کی طرف رجوع کرے گا مشورہ دیئے اور وہ اس سے رجوع کر کے فتویٰ حاصل کرتے تھے مگر اس دور میں عام طور سے روح تقلید سرایت کر گئی تھی اور مقلد اپنے امام کے فتویٰ سے ہٹ کر کسی اور کا فتویٰ اپنے لئے جائز نہیں رکھتا تھا گویا حق

صرف اُس کے امام کے دل وزبان پر اترا تھا۔صورت حال یہ تھی کہ اس دور کے فقہائے حنیفہ کے پیشوا اور مسلم امام ابوالحسن عبداللہ الکرخی نے یہ تک کہہ دیا کہ ہروہ آیت یا حدیث جو اس طریق کے موافق نہ ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ مؤول یا منسوخ ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے لئے اجتہاد کے دروازے بند کر لئے۔

واضح رہے کہ یہ حال صرف علمائے احناف کا ہی نہ تھا بلکہ اس دور کے علماء نے عام طور پر ایک معین مذہب کا التزام کرلیا تھا جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکتے تھے اور اجمالاً وتفصیلاً اپنی پوری طاقت وہ اس مذہب کی تائید میں صرف کر دیتے تھے۔ائمۃ گویا ان کے نزدیک معصوم تھے حالانکہ خود ائمۃ اربعہ کے اعترافات موجود ہیں کہ اذا صح الحدیث فھو مذھبی یعنی اگر حدیث صحیح موجود ہوتو وہی میرا مذہب ہے یا اگر میرا قول احادیث صحیحہ سے ٹکرائے تو اسے دیوار پر ماردو۔مگر عملی طور روح تقلید عام ہوگئی اور علماء نے عام طور سے ڈگیں ڈال دیں اور تقلید کے خوگر بن گئے۔لیکن اس عمومی صورت حال کے باوجود یہ اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے لیکر عہد موجود تک ایسا دور امت مسلمہ پر کبھی نہیں گذرا جب مذکورہ جمود وتقلید سے لڑنے کے لئے ہر دور کے علماء وفقہاء نے اس صورت حال سے بغاوت کی اسے آپ نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہی کیوں نہ کہیں مگر بہرحال انہوں نے اپنی چھاپ چھوڑی اور تقلید وجمود کی کیفیت سے برسرپیکار رہے جن میں سے کچھ نام یہ ہیں۔

شیخ عبداللہ بن مرالدبوسیؒ (م۴۳۰ھ) نے ''تأسیس النظر'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی یہ کتاب تقریباً ۸۶ قواعد فقیہ پر مشتمل ہے جو تقلید جامد کی نفی ہے اسی طرح شیخ عزبن عبدالسلام الشافعیؒ (م۶۶۰ھ) کی کتاب ''قواعد الاحکام فی مصالح الانام'' ہے۔اسی طرح عبدالرحمٰن بن رجب الحنبلی (۷۶۵ھ) کی کتاب القواعد الفقھیہ ہے۔فقہ مالکی میں شیخ القرامی (م۷۶۵ھ) کی کتاب کتاب الفروق ہے جس میں انہوں نے پانچسو پچاسی (۵۸۵) قواعد فقہیہ

جمع کیئے ہیں، شیخ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱) کی کتاب ''الأشباہ والنظائر'' اور ابن نجم المصری الحنفی (م ۹۷۰ھ) کی بھی کتاب کتاب لأشباہ والنظائر ہے۔ یہ کتابیں عام فقہی قواعد میں جھملاتے ستاروں کی مانند ہیں اور ان میں عام اور بنیادی فقہی قواعد سے بحث کی گئی ہے جیسے الامور بمقاصد ھا، انماالأعمال بالنیات یا جیسے العبرۃ فی لعقود بصیغتھا۔ یہ قواعد ظاہر ہے کہ اُن ضوابط اور اصول فقہیہ سے عبارت ہیں جو حادثاتی احکام کے سلسلہ میں مسائل کے استخراج واستنباط میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور استخراج احکام میں ان کی پاسداری کی جاتی ہے۔ ۱۵

۳- شرح، تخریج، تدوین اور تعلیل وغیرہ جیسے بہت سے اہم کام کیئے گئے:

جیسا کہ عرض کیا گیا اس دور میں تقلید کا عمومی رواج ہوا مگر اس کے پہلو بہ پہلو دیگر بہت سے علمی کام کئے گئے مثلاً مختصرات کی شرحیں لکھی گئیں اور مطولات کا اختصار ہوا اُن احادیث کی تخرج کی گئی جنہیں ائمۃ فقہ نے اپنی کتابوں میں بطور استدلال تو استعمال کیا تھا مگر ان کا منبع مخرج واضح نہیں تھا، اسی طرح مختلف مذاہب فقہیہ کی باضابطہ تدوین کا کام کیا گیا اور علل وغیرہ پر کتابیں لکھی گئیں ذیل میں ہم مختلف مذاہب فقہیہ کے بعض اہم علماء اور اُن کے کارناموں کا مختصراً بیان کریں گے۔

أ: اکابر فقہائے احناف:

۱- ابوالحسن عبیداللہ بن الحسن الکرخیؒ (۲۶۰-۳۴۰) یہ عراق میں فقہ کے سردار ور بہت سے اکابر کے استاد تھے ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے المختصر اور امام محمد بن حسن کی جامع صغیر اور جامع کبیر کی شرحیں لکھیں۔

۲- ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاصؒ (م ۳۷۰ھ) یہ امام کرخی کے شاگرد تھے اور اُن کے بعد سردار ہوئے مختصر کرخی، مختصر طحاوی، جامع امام محمد کی شرح اور کتاب ادب القضاۃ علم فقہ میں ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔

۳- ابواللیث نصر بن محمد السمر قندی المشہور بامام الہدیٰ (م۳۷۳ھ) ہندوانی کے شاگرد تھے نوازل العیون والفتاویٰ اور خزانۃ الفقہ وغیرہ ان کی اہم تصنیفات ہیں انہوں نے جامع صغیر کی شرح بھی لکھی ہے۔

۴- ابوعبداللہ یوسف بن محمد الجرجانیؒ (م۳۹۸ھ) یہ امام کرخیؒ کے شاگرد تھے۔ چھ جلدوں میں خزانۃ الاکمل تصنیف کی۔ اور زیادات جامع کبیر اور المختصر لکرخی کی شرح لکھی مختلف رسائل کی ترتیب اور جمع وتدوین کا کام بھی کیا۔

۵- ابوزید عبداللہ بن عمر السمر قندیؒ (م۴۳۰ھ) علم خلاف پر ان کی سب سے پہلی باقاعدہ تصنیف ہے ''الاسرار'' ''نظم فی الفتاویٰ'' اور کتاب تقویم الادلۃ ان کی اہم کتابیں ہیں یہ فن مناظرہ میں طاق تھے اور بڑے بڑے لوگوں سے ان کے مناظرات مشہور ہیں۔

۶- ابوبکر خواہر زادہ محمد بن الحسین البخاریؒ (م۴۳۳ھ) ماوراء النہر کے علماء میں اُن کی عظمت مسلم ہے۔ مختصر تجنیس اور المبسوط ان کی اہم تصنیفات ہیں۔ خواہر زادہ ان کو اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مشہور عالم اور فقیہ قاضی ابوثابت محمد بن البخاری کے بھانجے تھے۔

۷- شمس الائمۃ ابوبکر محمد بن احمد بن سہل السرخسیؒ (م۴۸۳ھ) یہ امام حلوانی کے شاگرد تھے ان کی کتاب المبسوط تیس اجزاء میں شائع ہوئی ہے جسے قاھرہ کے مطبع السعادۃ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل حاکم المروزی کی کتاب الکافی کی شرح ہے۔ وہ بیک وقت امام، علامہ، حجت، متکلم، مناظر، صوفی اور مجتہد تھے انہیں حق گوئی کے صلہ میں حاکم وقت خاقان نے ایک کنوئیں میں قید کردیا تھا۔ وہیں سے انہوں نے اپنی کتاب المسبوط کا املا اپنے شاگردوں کو کرایا جو کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھ کر لکھتے تھے۔ المسبوط کے علاوہ انہوں نے اصول فقہ میں شرح سیر کبیر اور مختصر طحاوی وغیرہ بھی لکھی ہے۔

۸- علی بن محمد البزدویؒ (۴۰۰-۴۸۲ھ) انہوں نے گیارہ جلدوں میں مبسوط لکھی اور جامع

کبیر اور جامع صغیر کی شرح کی۔ وہ اصول فقہ میں کتاب اصول بزدوی کے بھی مولف ہیں فقہ میں غناء الفقہاء بھی ان کی تصنیف ہے۔

۹- ابوبکر بن مسعود بن احمد الکاسانی الملقب بملک العلماءؒ (م ۵۸۷ھ) فقہ حنفی میں ان کی کتاب البدائع والصنائع اپنی حسن ترتیب کے لئے بہت مشہور ہے۔ انہوں نے اپنے شیخ علاؤالدین محمد بن احمد السمرقندی کی کتاب تحفۃ الفقہاء کی شرح بھی لکھی ہے۔

۱۰- فخر الدین حسن بن منصور الفرغانی المعروف بقاضی خاںؒ (م ۵۹۲ھ) یہ بہت بڑے امام تھے انہوں نے مشہور ومتداول فتاوے، واقعات، امالی اور محاضرات کی تالیف کی ہے اور زیادات، جامع صغیر اور کے ادب القضاۃ وغیرہ کی شرح لکھی ہے۔ ان کا شمار مجتہدین فی المسائل میں کیا جاتا ہے فقہ میں اُن کی تصحیح قدوری دوسری تمام تصحیحات پر مقدم ہے۔

۱۱- علی بن ابی بکر عبدالجلیل الفرغانی المرغینانیؒ (م ۵۹۲ھ) یہ امام، فقیہ اور حافظ تھے، کتاب المنتقیٰ، نشر المذہب، التجنیس، مناسک الحج، مختارات النوازل، کتاب الفرائض ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ قدوری کی شرح الہدایہ کے نام سے انہوں نے ہی لکھی ہے اور اسی بنا پر وہ صاحب الہدایہ کے لقب سے مشہور ہیں۔

ب:- اکابر فقہائے مالکیہ

۱- محمد بن یحییٰ بن لبابہ الاندلسیؒ (م ۳۲۱ھ) وہ اپنے معاصرین میں مذہب کے سب سے بڑے حافظ نیز عقد شروط اور علل کے متبحر عالم تھے۔ یہ ایک مجتہد تھے اور فقہ فتاویٰ میں اختیارات مذاہب کے دائرہ سے باہر تھے۔ فقہ میں ان کی متعدد تصنیفات میں مثلاً منتجمہ، کتاب الوثائق وغیرہ منتخبہ میں انہوں نے مسائل مدونہ کی شرح کی ہے۔

۲- ابوبکر بن العلاء القشیریؒ (م ۳۴۴ھ) یہ بصرہ کے رہنے والے تھے پھر مصر چلے گئے تلامذہ قاضی اسماعیل سے فقہ کی تعلیم حاصل کی اور بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے

بعض یہ ہیں کتاب الاحکام یہ اسماعیل بن اسحاق کی کتاب کا اختصار بھی ہے اور اس پر اضافہ بھی، کتاب الرد علی المزنی، کتاب اصول الفقہ اور کتاب القیاس وغیرہ۔

۳- محمد بن حارث بن اُسد الخُشنیؒ (م ۳۶۱ھ) انہوں نے قیروان میں فقہ کی تعلیم حاصل کی پھر اندلس آگئے اور قرطبہ میں توطن اختیار کرلیا۔ وہ فقہ کے حافظ، فتویٰ کے عالم اور مسائل میں عمدہ قیاس کرنے والے تھے۔ انہوں نے مذہب امام مالک میں الاتفاق والاختلاف کے نام سے ایک کتاب لکھی اور ایک کتاب امام مالک کی اس رائے کے متعلق لکھی جس میں اُن کے تلامذہ نے اُن سے اختلاف کیا ہے اسی طرح ایک کتاب انہوں نے کتاب الفُتیا کے نام سے بھی تحریر فرمائی۔

۴- ابوبکر بن عبداللہ المُعیطی الاندلسیؒ (م ۳۶۷ھ) وہ فقہ مالکی کے حافظ اور امام تھے انہوں نے خلیفہ حکم کے لئے ابوبکر الاشبیلی کے ساتھ مل کر کتاب الاستیعاب کی تکمیل کی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قاضی اسماعیل کے بعض تلامذہ نے ایک ایسی کتاب لکھنی شروع کی تھی جس میں امام مالک کے خاص طور سے وہ اقوال درج ہوں جس میں اُن کے شاگردوں میں کسی کا اختلاف نہ ہو مولف نے اس کی پانچ جلدیں لکھ لی تھیں مگر اس کے بعد اُنکا انتقال ہوگیا پھر جب یہ کتاب خلیفہ حکم کو ملی تو انہیں یہ بہت پسند آئی چنانچہ انہوں نے اس کی تکمیل کرانی چاہی اور اس کے لئے انہوں نے معیطی اور ابوعمر کو بلایا اور ان دونوں نے اس کی تکمیل سو جلدوں میں کی۔

۵- ابومحمد عبداللہ بن ابی زید عبدالرحمٰن النضری القیروانیؒ (م ۳۸۶ھ) یہ اپنے وقت میں مالکیہ کے امام اور پیشوا تھے، یہ امام مالک کے مذہب کے جامع اور اُن کے اقوال کے شاگرد تھے۔ انہیں مالک الصغیر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ان کی بہت ساری تصنیفات ہیں جن میں نوادر، الزیادات علی المدونہ، مختصر المدونہ، تہذیب العتبیّہ اور کتاب الرسالہ

وغیرہ مشہور ہیں۔

۶- ابوبکر محمد بن عبداللہ الابہریؒ (م ۳۹۵ھ) یہ امام مالک کے مذہب کے شارح، اُن کے مذہب کے مطابق استدلال کرنے اور مخالفوں کی تردید میں ان کی تصنیفات ہیں یہ امام، ثقہ اور ثبت کے درجہ پر فائز تھے۔ انہوں نے بغداد میں فقہ کی تعلیم حاصل کی اور ابن عبدالحکیم کی مختصر کبیر اور صغیر کی شرح لکھی اور ساٹھ سال تک جامع منصور میں درس اور فتویٰ دیتے رہے ان کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تصنیفات میں ابن عبدالحکم کی مختصر کبیر اور صغیر کی شرح لکھی اس کے علاوہ ابہری کی تصنیفات میں الردعلی المزنی، کتاب الاصول اور کتاب اجماع اھل المدینہ بہت مشہور ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد عراق میں امام مالک کا مذہب بہت کمزور ہو گیا۔

۷- قاضی عبدالوھاب بن نصر البغدادی المالکیؒ (م ۴۲۲ھ) انہوں نے ابہری کے کبار تلامذہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی کسی وجہ سے ناراض ہو کر بغداد سے مصر آ گئے تھے جہاں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ مصر میں انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً کتاب النصر لمذہب امام دارالہجرہ، المعونۃ لمذھب عالم المدینہ، کتاب الأدلہ فی مسائل الخلاف، رسالہ ابن ابی زید اور مدونہ وغیرہ کی شرح۔

۸- ابوالولید سلیمان بن خلف الباجیؒ (م ۴۹۴ھ) یہ امام ابن حزم الظاہری کے معاصر تھے اور اُن سے اُن کے مناظرات مشہور ہیں، اندلس میں علم حاصل کیا پھر مشرق کا سفر کیا اور وہاں بہت علم حاصل کیا۔ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں مثلاً کتاب الاستبتاء فی شرح الموطا پھر الاستبتاء کا اختصار انہوں نے کتاب المنتقیٰ کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ کتاب السراج فی علم الحجاج، کتاب مسایل الخلاف، کتاب المھذب فی اختصار المدونہ، شرح المدونہ، کتاب احکام العقول فی احکام الاصول وغیرہ ان کی مشہور تالیفات ہیں۔

۹- ابوالولید محمد بن احمد بن رشد القرطبیؒ (۵۲۰ھ) اندلس اور مغرب میں اپنے وقت کے فقہاء کے سردار تھے۔ صحت نظر، جودت تالیف اور فقہی مسائل میں ان کی دقت نظر کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ روایت سے زیادہ درایت میں ماہر تھے۔ ان کی تالیفات میں کتاب البیان والتحصیل لمافی المستخرجہ من التوجیہ والتعلیل، کتاب المقدمات لاوایل کتب المدونہ شامل ہیں نیز طحاوی کی کتاب مشکل لآثار کا اختصار بھی کیا ہے ان کے علاوہ بھی ان کی متعدد تالیفات ہیں۔

۱۰- قاضی ابوالفضل عیاض بن موسیٰ بن عیاض الیحصبیؒ (م۵۴۱ھ) اپنے وقت میں حدیث وتفسیر کے امام، فقیہ اصول واحکام کے واقف اور امام مالک کے مذہب کے حافظ تھے ان کی تالیفات میں اکمال العلم فی شرح صحیح مسلم، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ، مشارق الانوار فی تفسیر غریب الموطا والبخاری ومسلم اور کتاب ترتیب المدراک وتقریب المسالک لمعرفۃ اعلام مذہب مالک وغیرہ مشہور ہیں۔

ان کے علاوہ مشاہیر مالکیہ میں اسماعیل بن مکیؒ (م۵۸۱ھ) ابن رشد الشہیر بالحفید صاحب بدایۃ المجتہد المجتہدؒ (م۵۹۵ھ) ابن نجم بن شاس الجذامیؒ (م۶۱۰ھ) شامل ہیں جنہوں نے فقہ مالکی کی متعدد جہات سے خدمات انجام دیں۔

ج: اکابر فقہائے شافعیہ:

وہ لوگ جنہوں نے امام شافعیؒ کے مذہب میں تالیفات کیں اور اس کی اشاعت واصلاح کے لئے ممتاز ہوئے ان کی کثریت عراق، خراسان اور ماوراء النہر سے تعلق رکھتی ہے، اس سلسلہ کے چند اہم نام یہ ہیں:

۱- ابواسحٰق ابراہیم بن احمد المروزیؒ (م۳۴۰ھ) وہ اپنے دور میں فقہ شافعی کے امام تھے۔ ابن شریح کے بعد عراق میں انہیں کو امامت ملی انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور

المزنی کی شرح لکھی ان کے تلامذہ میں بہت مشہور ہستیاں شامل ہیں۔ان کی قبر امام شافعیؒ کے قبر کے قریب ہے۔

۲- ابواحمد محمد بن سعید بن ابی القاضی الخوارزیؒ (م۳۴۰ھ) فقہاء شافعیہ میں ان کا قد بہت بلند ہے۔کئی بلند پایہ علمی کتابوں کے مصنف ہیں مثلاً کتاب الحاوی والعمدۃ القدیمین اسی طرح اصول میں ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام الہدایہ ہے۔

۳- قاضی ابوحامد احمد بن بشر المروزیؒ (م۳۷۲ھ) یہ ابواسحاق کے تلامذہ میں سے ہیں ان کی کتاب الجامع بہت مشہور ہے جو اصول اور فروع پر حاوی ہے اسی طرح انہوں نے مختصر المزنی کی شرح بھی لکھی ہے۔

۴- محمد بن اسماعیل المعروف بالقفال الکبیر الشاسیؒ (م۳۶۵ھ) یہ ماوراء النہر کے رہنے والے تھے اصول فقہ میں اُن کی کتاب ہے نیز انہوں نے امام شافعی کی کتاب الرسالہ کی شرح بھی لکھی ہے اور ماوراء النہر ہیں انہیں کے ذریعہ امام شافعیؒ کی فقہ کی اشاعت ہوئی۔

۵- ابوعلی الحسین بن شعیب السنجیؒ (م۴۰۳ھ) یہ قاضی ابوالحسین القفال کے اہم تلامذہ میں سے تھے یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عراق اور خراسان کے دونوں طریقوں کو جمع کیا ہے۔ انہوں نے المختصر کی شرح لکھی جسے امام الحرمین الجوینی المذہب الکبیر کہتے تھے اس کے علاوہ انہوں نے تلخیص ابن القاضی اور فروع ابن الحداد کی شرح بھی لکھی ہے۔

۶- ابوحامد احمد بن محمد الاسفرائینیؒ (م۴۰۸ھ) یہ طریقۂ عراق کے شیخ مذہب کے امام اور حافظ تھے۔بغداد میں دین ودنیا کی ریاست انہیں حاصل ہوئی۔شرح مزنی کے متعلق انہوں نے اپنی یادداشتیں لکھیں۔ان کے متعلق قدوری کا قول تھا کہ وہ امام شافعیؒ سے زیادہ فقیہ اور مناظر تھے۔یہ اصحاب ابی حنیفہ ہیں ابوعبداللہ الصیمر ی کے معاصر تھے۔

۷- عبداللہ بن احمد المعروف بالقفال الصغیرؒ (م۴۱۷ھ) ان کا رتبہ فقہائے خراسان میں ویسا ہی

ہے جیسا کہ ابو حامد اسفرا ئینی کا عراق میں ہے۔ان کا شمار کبار فقہائے خراسان میں کیا جاتا ہے۔ مذاہب شافعی کے متعلق ان کا طریقہ جسے ان کے تلامذہ نے اُن سے سیکھا تھا نہایت مضبوط اور مہذب ہے۔

ان حضرات کے علاوہ فقہائے شافعیہ میں درج ذیل حضرات کی بھی کافی شہرت ہے ابو اسحٰق ابراہیم بن محمد الاسفرا ئینیؒ (م ۴۱۸ھ) ابو الطیب طاہر بن عبداللہ الطبر یؒ (م ۴۵۰ھ) ابو الحسن علی بن محمد الماوردی صاحب الاحکام السلطا نیہؒ (م ۴۵۰ھ) ابو عاصم محمد بن احمد الہروی الشافعیؒ (م ۴۵۸ھ) ابو اسحٰق ابراہیم بن علی الفیر وزآبادی الشیر ازیؒ (م ۴۷۶ھ) ابن الصبّاغؒ (م ۴۷۷ھ) ابو المعالی عبد الملک عبداللہ الجوینی المعروف بامام الحرمینؒ (م ۴۷۸ھ) حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالیؒ (۴۵۰ھ-۵۵۰ھ) ابو القاسم عبد الکریم بن محمد القزوني الرافعیؒ (م ۶۶۳ھ) محی الدین ابو زکریا یحیٰ ابن شرف التوویؒ (م ۶۳۱ھ) یہ سب اعلام شافعیہ میں شامل ہیں فقہ شافعی ان کی وجہ سے سرسبز و شاداب رہی۔

۱- اکابر فقہائے حنابلہ

۱- موفق الدین عبداللہ بن احمد المعروف بابن قدامہ المقدسیؒ (م ۶۲۰ھ) یہ فقہ حنبلی میں امامت کے درجہ پر فائز تھے ان کی کتاب ''المغنی'' علم فقہ میں ایک موسوعہ اور انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے یہ کتاب قاہرہ سے سید رشید رضا کی نگرانی میں نو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۲- شمس الدین عبد الرحمٰن بن قدامہ المقدسیؒ (م ۶۸۲ھ) ان کی کتاب الشرح لکبیر علیٰ متن المقنع فقہ حنبلی میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے یہ کتاب بارہ جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

۳- شیخ الاسلام ابی العباس تقی الدین احمد بن عبد الحلیم المعروف بابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) ابن تیمیہ فقہ میں اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے ان کی کتاب (الفتاویٰ الکبریٰ) پندرہ اجزاء میں

ریاض سے شائع ہوچکی ہے۔ان کی تصنیفات بے شمار ہیں ۔اصول میں ان کی کتاب اصول الفقہ بہت مشہور ہے۔

۴- الشیخ منصور بن یونس البھوتیؒ (۱۰۰۰ھ-۱۰۵۱) ان کی کتاب ''کشاف القناع علیٰ متن الاقناع'' فقہ حنبلی میں بہت مشہور ہے۔ان کے علاوہ درج ذیل افراد نے بھی فقہ حنبلی کی قابل قدر خدمات انجام دیں محمد بن مفلح المقدسیؒ (م۷۶۲ھ) کی الفروع ابن قیم الجوزیہؒ (م۷۵۱ھ) کی اعلام الموقعین عن رب العالمین اورزاد المعادؒ وغیرہ۔

مندرجہ بالاتفصیلات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پانچویں دور کے نصف اول تک علماء کرام اورفقہائے عظام کے یہاں تقلید گوتھی مگرتقلید جامد نہ تھی بلکہ ان کی بعض خوبیاں تواس پائے کی تھیں جوانہیں نہایت بلند پایہ اورعظیم المرتبت ثابت کرتی ہیں۔جن کی کچھ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- **تخریج مناط:-** وہ لوگ اُن احکام کے اسباب وعلل ظاہر کرتے تھے جن کوان کے ائمہ نے مستنبط کیا تھا۔ایسے لوگوں کوعلمائے تخریج کہا جاتا تھا۔تخرج مناط کا مطلب ہے، کہ حکم کی علت سے بحث کی جائے۔ان علل کی تخریج میں علماء باہم اختلاف بھی کرتے تھےاوران مسائل کے متعلق بھی فتویٰ دیتے تھےجن کے متعلق ان کے امام کی کوئی تصریح موجود نہ ہو بلکہ صرف علت معلوم ہو۔اورانہوں نے نہ صرف مسائل پرفتوے دیئے بلکہ ان علتوں کی روشنی میں فقہ کےاصول وقواعد بھی مرتب کئے۔

۲- ترجیح آراء:-اس دور کے علماء کی ایک اورخصوصیت مختلف آراء کے درمیان ترجیح کرنے کی تھی جس کے دو پیمانے تھے:

۱- ترجیح روایت کے اعتبار سے

۲- ترجیح درایت کے اعتبار سے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام کا مذہب نقل کرنے میں مختلف وجوہات کی بنا پر ان کے شاگردوں کے درمیان اختلاف ہوجاتا تھا یا امام کا قول قدیم کچھ ہوتا تھا اور قول جدید کچھ اور اس بنا پر علماء کا یہ کام تھا کہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں اور یہ بتائیں کہ امام کے کس قول کو ترجیح دی جائے چنانچہ زیادتی اعتماد کی بنا پر جس شخص کی روایت پر ان کو اعتماد ہوتا اس کی روایت کو انہوں نے ترجیح دے دی۔ جیسا کہ حنفیہ نے امام محمدؒ کی روایتوں میں اُن کی اُن کتابوں کو ترجیح دی ہے جن کی روایت اُن سے ابوحفص الکبیر اور جوزجانی نے کی ہے اور اسی کا نام انہوں ظاہر الروایہ رکھا اسی طرح شافعیہ نے ربیع بن سلیمان کی روایتوں کو ترجیح دی۔ یہاں تک کہ جب ربیع اور مزنی کی روایتوں میں تعارض ہوتا ہے تو وہ ربیع کی روایتوں کو مقدم سمجھتے ہیں حالانکہ فقہ میں وہ مزنی کی بلندئ مراتب کے معترف ہیں اسی طرح جب حرملہ کی روایتیں ان دونوں سے متعارض ہوتی ہیں تو وہ حرملہ کی روایتوں کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اختلاف تو فطری طور پر واقع ہونے ہی تھے لیکن ترجیح فی المذہب میں ان فقہاء کی رایوں کا اعتبار کیا گیا جن کی رائیں روایتاً اور درایتاً امام کے مسلک سے قریب ترتھیں۔

۳- تائید مذاہب: اس دور کے علماء کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اجمالاً اور تفصیلاً اپنے امام کی تائید کرتے تھے۔ یعنی انہوں نے اپنے اماموں کی تائید بے شک کی مگر اس دلیل کے ساتھ کہ ان کے امام فقہ واستنباط کے جامع اور نکات شریعت کے بہت بڑے عالم تھے جن کی نظیر لانا مشکل ہے۔ بیشک اس میں بعض لوگوں نے غلو بھی کیا اور مخالفین پر عیوب بھی لگائے مگر ظاہر ہے علم ومطالعہ کے بغیر ایسا کرنا ناممکن تھا۔ اس بنیاد پر علم خلاف کی بنیاد بڑی اور مناظرات ومجادلات بھی کثیر تعداد میں ہوئے۔

۴- مناظرات ومجادلات کی کثرت

اس دور کی اہم خصوصیات میں مناظرات اور مجادلات کی کثرت بھی ہے حالانکہ ان

مناظروں کا آغاز امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ کے دور میں بھی تھا خود امام شافعیؒ نے ان مناظرات کا ذکر کیا ہے جو اُن کے اور محمد بن حسن فقیہ عراق کے درمیان ہوئے تھے لیکن ابتداء میں ان کا مقصد صرف حکم صحیح کا استنباط تھا اور حق ظاہر ہونے کے بعد وہ اپنی آراء سے رجوع بھی کر لیتے تھے لیکن بعد کے ادوار میں مناظروں کی یہ اسپرٹ قائم نہ رہ سکی اب اس کا مقصد حکم صحیح کے استنباط کے بجائے امراء اور وزراء کی خوشنودی حاصل ہوگئی اور دقائق شریعت کا استنباط، علل مذاہب کا اثبات اور اصول فتاویٰ کی تحیص کا مقصد پس پشت چلا گیا۔ چنانچہ امام غزالیؒ جو خود اس میدان کے مراد اور اس اشہب علم کے شہسوار تھے اُن کا دل اِن مناظرات ومجادلات سے ایسا کھٹا ہوا کہ وہ اس سے تایب ہوگئے اور اس طرح کے لوگوں پر خوب تنقیدیں کیں۔امام صاحب نے اس کی پوری تفصیل اپنی کتاب احیاء علوم الدین میں بیان کی ہے۔ایسے لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے نفس کو دھوکہ دیتے اور اسے تعاونو فی الدین سمجھتے ہیں حالانکہ اس کے لئے آٹھ شرطیں بہت ضروری ہیں جو ان کے یہاں مفقود ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس مناظرہ کی کچھ آفتیں بھی ہیں جو یہ ہیں:

۱- حسد

۲- لوگوں پر تفوق حاصل کرنے کا جذبہ

۳- حقد یعنی سخت اور مخفی دشمنی جسے کینہ بھی کہتے ہیں

۴- غیبت

۵- تجسس

۶- لوگوں کے خوشی پر رنج اور رنج سے خوشی

۷- نفاق

۸- حق سے روگردانی

۹- رہا امام صاحب کے نزدیک مناظرہ کی یہ عظیم الشان آفتیں ہیں جو فقہاء کو اس سطح سے گرا دیتی ہیں جس پر وہ متمکن ہوتا ہے۔

۴- تعصّبات مذہبی

تیسری بلکہ چوتھی صدی ہجری تک یعنی جب تک اجتہاد کی روح زندہ رہی مذہبی منافرت وتعصب نہیں تھا زیادہ سے زیادہ جو چیز واقع ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ایک مجتہد کا اجتہاد اگر دوسرے سے متصادم ہوتا تو وہ اس کی علمی قدر و قیمت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس سے گفتگو بھی کرتا تھا اور بذریعہ تحریر بھی وضاحت کرتا تھا لیکن باہمی احترام وصحبت میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی تھی چنانچہ امام لیث بن سعدؒ نے امام مالکؒ کو جو خط لکھا ہے وہ اس کا مظہر ہے اسی طرح امام شافعیؒ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل پر تنقید کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہؒ کے دست نگر ہیں۔ وہ امام محمدؒ سے مناظرے بھی کرتے ہیں اور اکثر اُن کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ امام احمد بن حنبلؒ سے جو فقہ میں ان کے شاگرد تھے کہتے ہیں کہ جب حدیث تمہارے نزدیک صحیح ہو تو مجھے اس کی اطلاع دو اسی طرح وہ امام مالک کو روشن ستارہ بتاتے ہیں۔ لیکن جس دور میں تقلید کی روح علماء میں سرایت کر گئی اور وہ اپنے امام کی مدافعت پر آمادہ ہوئے تو اُن کے ذہنوں میں تعصب بھی آ گیا اور اب وہ فریق ثانی کو خصم یعنی دشمن یا مدمقابل سمجھنے لگے اور دوسرے مذہب والوں کو صحیح بات کی قبولیت بھی حرام قرار پائی اور ایک دوسرے کے پیچھے نمازیں پڑھنی بھی غلط ٹھہریں۔

اس جذبہ کو جس چیز نے مہمیز دیا وہ دینی مسائل میں امراء کی دراندازی ہے انہوں نے علماء سے مطالبہ کیا کہ اُن کے سامنے مناظرے کئے جائیں اور ہر فریق مذکورہ مسئلہ میں اپنے دلائل اُن کے سامنے رکھے اور وہ خود حکم بن کر فیصلہ کریں اس وجہ سے جھگڑا اور بڑھا اور علماء کی محاذ آرائی میں شدت آ گئی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ فقہ اسلامی کے تدریج وارتقاء کی مختصر تاریخ ہے۔ جس کے بیان کی ضرورت ہمیں اس لئے پڑی تا کہ ہم اس کی روشنی میں یہ جائزہ لے سکیں کہ ہمارے عہد میں فقہ اسلامی کی کیا صورت حال ہے اور اس کی خدمت کا طریق کار موجودہ عہد میں کیا ہوسکتا ہے اور مولانا تقی امینیؒ نے اس سلسلہ میں کیا پیش رفت کی۔ اس لئے اگلا باب جو چوتھا اور آخری باب ہے میں ہم مولانا تقی امینیؒ کی فقہی خدمات کا ذکر یں گے۔ **واللہ الھادی وھو المستعا ن**

حواشی

۱ مختار الصحاح مادہ (ف ق ہ)

۲ القاموس المحیط، مختار الصحاح، المصباح المنیر من باب ف ق ہ

۳ حقیقۃ الفقہ ج ۱

۴ احیاء العلوم جلد اوّل لفظ الاول الفقہ ص ۳۰

۵ ایضاً ص ۳۱

۶ نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ص ۱۳۱

۷ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص ۳۸ از مولانا تقی امینی

۸ مسلم الثبوت کے حاشیہ التعلیق المنعوت ص ۷

۹ حوالہ سابق

۱۰ حوالہ سابق

۱۱ احیاء علوم الدین للغزالی، جلد اللفظ الاوّل الفقہ

۱۲ التویہ /۱۵۴

۱۳ الاعراف/ ۱۵۷-۱۵۶

۱۴ احیاء العلوم ج/ اللفظ الاول الفقه

۱۵ الفقه الاسلامی آفاقۂ و تطورة تالیف الدکتور عباس حسنی محمد ص ۳۲ ط
الامانة العاية لرابطة العالم الاسلامی بمکة المکرمه

۱۶ الصحیح للبخاری کتاب العلم

۱۷ سنن الترمذی کتاب العلم

۱۸ سنن ابی داوٗد کتاب العلم

۱۹ مفردات القرآن للامام الراغب الاصفہانی ص ۱۲۶

۲۰ تفسیر خازن ص ۸۶ بحوالہ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص ۲۹

۲۱ البقرۃ ۲۶۴

۲۲ احیاء علوم الدین جلد ۱، اللفظ الاول الفقہ

۲۳ ابوداوٗد حاکم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ اس کی روایت کی ہے۔

۲۴ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ص ۱۸۱، ۱۸۲ بحوالہ شرح مسلم الثبوت ص ۵۲۵

۲۵ الفقہ الاسلامی آفاقہ وتطورہ ص ۷۸، ۷۹ عباس حسن محمد، بحوالہ ابن عابدین شامی حاشیہ جلد ۵، ۸۸

۲۶ النساء آیت ۲۴

۲۷ التوبہ آیت ۳۳

۲۸ سورہ جمعہ آیت ۳

۲۹ النساء آیت ۵۹

۳۰ النساء ۱۱۵

۳۱ آل عمران ۱۵۹

۳۲ الجامع للترمذی ابواب الفتن

۳۳ الاشباہ والنظایر القاعدہ السادسہ

۳۴ منہاج الاصول للبیضاوی الکتاب الثالث فی الاجماع

۳۵ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ۱۲۳، ۱۳۴، بحوالہ التمہید لتعریف ائمۃ التجدید (مخطوط) لشاہ ولی اللہ الدہلوی

۳۶؎ نورالانوار مبحث القیاس ص ۲۲۴

۳۷؎ الحشر آیت ۲

۳۸؎ التوبہ ۱۲۲

۳۹؎ منہاج الاصول الکتاب الرابع فی القیاس

۴۰؎ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص ۴۴

۴۱؎ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی الدکتور الشیخ مصطفیٰ السباعی ص ۱۰۴

۴۲؎ السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی ص ۱۰۹، ۱۱۰، للشیخ مصطفیٰ السباعی

۴۳؎ اس باب کی پوری تفصیل الاستاذ محمد خضری ؒ بک کی کتاب تاریخ التشریع الاسلامی کے باب چہارم اور پنجم نیز مولانا تقی امینی ؒ کی کتاب فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر کے صفحات ۲۵ تا ۵۷ سے لئے گئے ہیں۔

۴۴؎ النساء آیت ۸۳

۴۵؎ الفقہ الاسلامی آفاقہٗ وتطورہٗ الدکتور عباس محمد ص ۳۹

۴۶؎ حوالہٴ بالا لقاسم عبدالکریم بن محمد القزوینی الرافعی (م ۶۲۳ھ)

۴۷؎ حوالہٴ بالا ص ۴۰

۴۸؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو المدخل للفقہ الاسلامی ص ۱۹۹ - ۲۱۵ الدکتور محمد سلام مذکور

باب چہارم

مولانا تقی امینیؒ کی فقہی خدمات

مولانا تقی امینیؒ کی فقہی خدمات

تمہید:

مولانا تقی امینیؒ ایک ذہن رسا کے مالک تھے اُن کو دینی علوم میں گہری بصیرت حاصل تھی وہ دراصل حدیث نبوی من یرد اللہ خیراً یفقہ فی الدین کا صحیح مصداق تھے۔ فقہ میں ان کی بصیرت صرف جزئیات کا احاطہ کرتی تھی کہ فقہ کی جزئیات کے ماہرین کی اس دور میں کوئی کمی نہیں بلکہ فقہی احکام و مسائل کے جاننے والے ان کی دور میں کیا کسی دور میں کبھی کوئی کمی نہ ہوئی ہے۔ اصل معاملہ مسائل پر پھیل کر سوچنے اور فقہ کی روح پر غور وفکر کا ہے اور بلاشبہ اس طرز پر سوچنے والے آج بھی کم ہیں اور پہلے بھی کم ہی تھے۔ کسی فقیہ کے فقاہت کی اصل معنویت اس جہان فکر سے متعین ہوتی ہے جو اس کا سرمایہ ہوتی ہیں ارو اس عہد کے مسائل پر غور وخوض کرنے سے متعین ہوتی ہے۔ جس عہد میں رہ رہا ہوتا ہے۔ وضو اور نماز کے احکام و مسائل یا کنوئیں میں بلی، کتا یا کوئی نجس چیز پڑ جانے کی صورت میں کتنے ڈول پانی نکال دینے سے وہ پانی پاک ہوجاتا ہے یہ اصل فقاہت نہیں بلکہ فقہی قوانین اور اسلامی دستور کو من حیث الکل جاری و نافذ کرنا اور اس کے لیے اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لینا بحثیت دستور اس کے اوّلیات اور تقدمات نیز تاخیرات وتاجیلات کا جائزہ لینا، قانون کی تدوین جدید اجتہاد استنباط، تفریح غور وفکر اور موجود عہد کی ضرورتوں کا الٰہیات اسلامی کی روشنی میں حل پیش کرنا بھی دراصل فقیہ یا مجتہد عصر کا کام ہوتا ہے۔ انہیں مبادیات کی روشنی میں ہم مولانا کے کاموں کی نوعیت متعین کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اوزان اور باٹوں پر رکھ کر ہم اُن کے کاموں کی اصل قدر و قیمت بتانا چاہتے ہیں۔

ان پہلوؤں سے جب ہم مولانا کے فقہی کاموں کا جایزہ لیتے ہیں تو ہمیں اُن کے یہاں

بڑی گہرائی اور گیرائی نظر آتی ہے۔ ان کے کاموں کے ہر پہلو کے جائزہ لینے کا دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا مگر جو واضح نقوش ان کے یہاں اس سلسلے میں ملتے ہیں اُن کی نشاندہی کرنے سے کچھ ان کی فقیہانہ تدبیر وبصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ جو کام وہ کر سکے اور جو کام وہ کرنا چاہتے تھے مگر اس کے لیے انہیں سازگار ماحول نہ مل سکا اور وہ ناتمام رہ گئے ان کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ شاید آگے کسی کو ان کاموں کی تکمیل کی توفیق نصیب ہو جو فقہی بنیادوں پر نظام اسلامی کی تشکیل وتدوین کے اس خواب کو پورا کر سکے جو دراصل حاصل زندگی اور متاع آخرت ہے۔

میری نظر میں مولانا کی فقہی خدمات کا جائزہ چار حیثیتوں سے لیا جاسکتا ہے اور ان میں سے ہر ایک پہلو اس نوعیت کا ہے کہ اگر اسے اجاگر کرنے میں کئی ایک تحقیقی زندگیاں بھی صرف ہو جائیں تو وہی اصل کامیابی ہے۔

پہلا کام تو فقہ قانون اسلامی کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کا ہے ظاہر ہے اس کا یہ مفہوم قطعی نہیں ہے کہ قدیم فقہاء کی خدمات اور کارناموں کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس کا مقصد جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے صرف اور صرف یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی اس طرح سے ترتیب وتدوین کی جائے جو عہد حاضر کی قانونی ضرورت کو پورا کر سکے اور اگر اسلامی نظام حکومت قائم ہو جائے تو ہماری فقہ نئے عہد اور مزاج کا ساتھ دے سکے ظاہر ہے اس مختصر سے تعارف سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں اس لیے اس کے تفصیلی تعارف کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں مختصراً یہ بات واضح کر دوں کہ خدمت فقہ اسلامی کا اتنا اہم پہلو ہے جس کی ضرورت کا شدید احساس نباض ملت حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کو زندگی کے آخری مرحلہ میں ہوا تھا اور جس کے لیے انہوں نے زندگی کی ساری تگ وتاز کو چھوڑ کر خود کو اس کے لیے یکسو کر لیا تھا اور ماہرین اسلامیات کو یکجا کر کے اس کام کو کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مگر موت نے انہیں مہلت نہ دی اور وہ اس کام کو پورا نہ کر سکے۔

دوسرا پہلو مولانا کی فقہی خدمات کا یہ ہے کہ وہ اس مردہ امت میں اجتہاد کی روح پھونکنا

چاہتے تھے۔ان کے پیش نظر یہ بڑا کام بھی تھا کہ رح اجتہاد جو کبھی اس امت مرحوم کا خاص وصف و امتیاز تھا اور جو ایک مدت سے اس کے جسم میں سرد پڑ چکی تھی اس کو از سر نو تازہ کیا جائے اور اس طرح یہ امت ایک بار پھر اس مقام و مرتبہ پر فائز ہو سکے جہاں بیٹھ کر اس نے دنیا کی امامت اور پیشوائی کا فریضہ انجام دیا تھا اس کے لیے مولانا نے متعدد مضامین اور دو کتابیں بھی لکھی تھی۔اس مضمون میں مولانا کا فقہی خدمات کے اس پہلو سے بھی جائزہ لیا جائے گا۔

ایک تیسرا پہلو: مولانا کی فقہی خدمات کا یہ بھی ہے کہ شریعت کے احکام بے لچک نہیں ہیں۔شورائیت کی روح اسکا اصل مزاج ہے ہر عہد و زمانہ کے لحاظ سے اس کے فقہی قوانین میں ترمیمات کی جاسکتی ہیں اس کی واضح مثالیں خود حضورؐ کے فیصلوں میں اور خلافت راشدہ کے عہد میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ یہ مزاج ہر زندہ قانون کا ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ قانون زمانہ کے بدلتے ہوئے مزاج اور ذہن کا ساتھ نہیں دے سکتا بشریعت اسلامی کا یہی مزاج ہے جس نے اس کو رہتی دنیا تک کے لیے زندہ رکھا ہوا ہے۔مولانا کی نگاہ شریعت اسلامی کے اس پہلو پر بطور خاص تھی وہ ان علماء میں سے نہ تھے کہ اک ذرا زمانہ کا مزاج بدلا اور وہ تکفیر تفسیق کے فتووں سے لیس ہو کر آن وارد ہوئے۔شریعت کے اس پہلو کو منقح کرنے کے لیے مولانا نے ''احکام شرعیت میں حالات و زمانہ کی رعایت'' نامی کتاب لکھی اور اس پہلو کو بالکل واضح کر کے دکھایا۔

مولانا کی فقہی خدمات کا چوتھا پہلو جدید پیش آمدہ مسائل میں شریعت کے اشارات، دلالات اور اقتضادات سے کام لے کر مسائل کی تنقیح تھی۔ان مسائل میں ملکیت اراضی رویت ہلال، جدید مالیاتی مسائل مثلاً اسٹاک ایکسچینج کا شیئر کی خرید و فروخت تمسکات، حصص، اور بیمہ وغیرہ کے مسائل، بینکوں، پوسٹ آفسوں اور سیکولر حکومت کے ساتھ سودی معاملات اور مفاہمت بین المذہب وغیرہ کے مسائل ہیں۔اوران کا صحیح اسلامی حل ہے۔

ہم ان تمام پہلوؤں کا الگ الگ فصلوں میں جائزہ لیں گے اور انشاء اللہ یہ بات ثابت

ہو جائے گی کہ مولانا کو کس قدر فقہی بصیرت حاصل تھی اور شرعی مسائل میں وہ کتنا مجتہدانہ مزاج رکھتے تھے۔

(۱) فقہ اسلامی کی تدوین جدید

جیسا کہ قانون اسلامی کے ماہرین کو معلوم ہے کہ دور جدید میں قوانین اسلامی پر عمل پیرا ہونے کے لیے لازم ہے کہ فقہ کی تدوین اس انداز میں کی جائے جو عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو۔ ماضی میں فقہائے کرام نے الگ الگ جن فقہی مذاہب کی تدوین کی ہے چونکہ وہ سب شریعت کے واضح نصوص یا اجتہاد کی بنا پر متفرع ہیں پھر ان اجتہادات میں اپنے اپنے دور کی عکاسی بھی ہے اور متعدد مختلف فیہ مسایل کے پہلو بہ پہلو ایسی بہت سی جزئیات ہیں جن سے دور حاضر ہیں استفادہ کیا جاسکتا ہے اور جو شریعت کے روح اور مزاج کے عین مطابق ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے ایک ایسی فقہ کو مدوّن کیا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور اس منتشر امت کو یکجا اور متحد کر کے ایک پلیٹ فارم پر لانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

مولانا مرحوم کے نزدیک ''فقہ کی تدوین جدید'' یا تمام مکاتب فقیہہ بقدر استطاعت ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ مدّن کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر یہ کام ہو جائے تو اس بکھری ہوئی منتشر امت کو متحد کرنے میں بڑی کامیابی حاصل ہو جائے گی کیونکہ انتشار بالعموم مختلف مکاتب فقیہہ ہیں عدم اتحاد کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک اہم کام ہے اور کسی بھی ملت کے ہمدرد کو اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا مگر اس کا طریقہ کار اور لائحہ عمل کیا ہوگا اور کس طرح مختلف مذاہب فقیہہ سے منسلک اس امت کا ایک ہی مذہب و مسلک پر متحد کرنا ممکن ہو سکے گا۔ اس کے خدوکال کیا ہوں گے۔ آیئے مولانا مرحوم کی تحریروں میں ہی ان سوالات کا جواب تلاش کرتے ہیں۔

فقہ کی تدوین جدید کی اہمیت:

''فقہ کی تدوین جدید'' کی نزاکتوں اور باریکیوں کے متعلق مولانا رقمطراز ہیں:

''ہر کام کا ایک محل اور ہر تجویز کا ایک وقت ہوتا ہے بے محل کام اور بے موقع تجویز سے مفید نتیجہ نہیں برآمد ہوتا بلکہ الٹے مضر اثرات کا اندیشہ رہتا ہے۔ فقہ کی جدید تدوین کا معاملہ بھی موقع اور محل کی نزاکتوں سے تعلق رکھتا ہے جب تک ان نزاکتوں کو سامنے رکھ کر ان کے حدود اور خطوط متعین نہ کیے جائے گے۔ اس وقت تک خاطر خواہ کامیابی کی توقع ناممکن ہے اس لیے کام کی ابتداء سے پہلے ضروری ہے کہ فضا کی ہمواری کا اندازہ لگایا جائے اور معاشرے میں ضبط و انگیز کی صلاحیت کا جائزہ لیا جائے پھر جس درجہ کی صلاحیت اور ہمواری کا پتہ چلے اس درجے میں یہ کام انجام دیا جائے۔[۱]

پھر جس معاشرے میں اس قانون کو برسرِ عمل آنا ہے اس کے ضبط و انگیز کی صلاحیت کا پتہ کیسے لگایا جائے اور یہ کیسے معلوم ہو کہ معاشرہ ذہنی طور پر اس تبدیلی کے لیے تیار ہے مولانا اس بابت فرماتے ہیں۔

''ذیل میں چند چیزیں ذکر کی جاتی ہیں جن سے کسی معاشرے کے حالات اور اس کے ضبط کی صلاحیت کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی نیز یہ بات واضح ہوگی کہ وجودہ حالات میں کس درجہ کی تدوین قابل قبول ہوسکتی ہے اور اس کا نقشہ کیا ہونا چاہیے۔

دراصل مسلم معاشرے تین طبقوں میں تقسیم ہے اور تینوں کے زاویہ نگاہ میں بنیادی فرق ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کے سامنے نہ موجودہ حالات مسایل ہیں اور نہ اُن کو اسلامی قانون کی لچک اور ارتقائی صلاحیت کا اندازہ ہے۔ وہ حکومتی سطح پر نہ اسلام کو قائم کرنے کے لیے سوچ سکتا ہے اور نہ اس کی ضرورت اس کو محسوس ہوتی ہے۔ بس ایک محدود صورت میں چند جزئیات وفروع اس کے سامنے ہیں اور انہیں کی حد تک وہ کل اسلام کی نمائندگی کا دعویدار ہے۔ اس کے مقابل دوسرا طبقہ ہے جو اپنے ''امانت خانہ'' کے لعل و جواہر کے عوض دوسروں کے سنگ ریزے اور حرف ریزے

لے چکا ہے اس کی نظر میں ماضی کی عظیم الشان روایتیں جن پر قومی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے فرسودہ اور ازکار رفتہ ہو چکی ہیں۔ یہ طبقہ اپنے شاندار اور ماضی سے کٹ کر اس کا ایک جدید اڈیشن تیار کرنا چاہتا ہے جس کی تقریباً ہر چیز باہر سے برآمد کی گئی ہو۔

ان دونوں کے درمیان ایک اور طبقہ سے جو واقعی کچھ کرنے کا خواہشمند ہے۔ اور اگر اس کی خواہشوں کو جرئتمندانہ رہنمائی میسر آجائے تو اس سے بڑی توقعات وابستہ ہوسکتی ہیں۔ دراصل یہی طبقہ مسلم معاشرہ کی بیداری کی علامت ہے جس قدر اس میں اضافہ ہوگا اور علمی اور عملی میدان میں اس کی ترقی ہوگی اُسی قدر قوم ترقی یافتہ سمجھی جائے گی۔ فقہ کی جدید تدوین اس طبقے کے بے قرار دل کی آواز بن سکتی ہے اور اگر اس کی یہ آواز ہماری بے ذوقی اور کم نگہی کی نذر ہوگئی جیسا کہ اسکا قومی اندیشہ ہے تو نتیجہ نہایت بھیانک صورت میں ظاہر ہونا یقینی ہے یعنی پھر یہ طبقہ یا تو مجبوراً خودکشی کرلے گا۔ یا متجددین کے دام تزویر میں پھنس کر اپنے کو اسلام کی خودساختہ تعبیر کے حوالہ کردے گا۔[۲]

معاشرہ کی مذکورہ بالا تقسیم اگر صحیح ہے اور اس سلسلہ میں سنجیدہ اور مخلصانہ کوشش کرنے والوں کو ذہنی خودکشی یا متجددین کے دام تزدیر میں پھنسے اسے بچانا اگر مقصد ہے تو اس ضرورت کو کیونکہ پورا جائے دوسرے لفظوں میں فقہ کی جدید ترین کی صورت گری کس طرح کی جائے؟ مولانا اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جدید تدوین کی احتیاطی صورت یہ ہے کہ قانون کو دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے اولاً وہ قوانین جن کا تعلق عقاید، عبادات، اخلاق وغیرہ انسان کی انفرادی زندگی سے ہے ثانیاً وہ جس کا تعلق معاشرت، معاشیات وسیاسیات وغیرہ ملکی قانون سے ہے، عوام کا زیادہ تر تعلق پہلے حصہ سے ہے اس میں نہ کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور نہ موجودہ حالت میں قوم اس کی متحمل ہوسکتی ہے صرف جدید ترتیب قائم کرنے اور بعض مباحث کو مقدم یا موخر کرنے سے یہ کام ہوجائے گا۔ اور اگر اس

میں بھی کاٹ چھانٹ کی گئی تو تبدیلی کی ذہنیت عوام میں سرایت کر جائے گی اور قانون کا وقار ان کے دل سے نکل جائے گا جس سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی پھر دنیوی قانون کی طرح مذہبی قوانین بھی بے جان ہو کر رہ جائیں گے۔ دوسرے حصہ میں کافی غور وفکر کے بعد نقشہ متعین ہو سکے گا جس میں حالات وتقاضہ کے مطابق ترتیب قائم کرنا نئے پیش آمدہ مسائل کا حل دریافت کرنا اور جن مباحث کو زمانہ کے مفتی نے ختم کر دیا ہے ان کو ترتیب سے نکال دینا وغیرہ امور شامل ہیں'' ۳۲

اس نئی تدوین میں کام کا نقشہ کیا ہوگا؟ کیا تمام فقہوں کو ملا کر ایک نئی فقہ تیار کر دینا مولانا کا نصب العین تھا یا ان کے ذہن میں اس کے لیے کوئی اور نقشہ تھا مولانا اس سوال کا جواب دیتے ہیں:

اور ہی یہ بات کہ آئمہ قانون کے مختلف مذاہب کو سامنے رکھ کر ایک نئی فقہ تیار کی جائے اور اس پر عمل درآمد کی مسلم ممالک کو بھی دعوت دی جائے یہ قبل از وقت بات ہے۔ اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لیے کافی عرصہ درکار ہے دراصل قومی و جماعتی زندگی میں وہ وقت نہایت نازک ہوتا ہے جب اُس کو ایک مقام سے ہٹا کر دوسرے مقام پر لایا جاتا ہے اگر اس میں دوسرے مقام کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوتی ہے اور پہلے سے بھی وہ اکھڑ چکی ہے تو نتیجہ لازمی طور سے ذہنی ''طوائف الملوکی'' کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی تو یہ موڑ اتنا سخت ہوتا ہے کہ بنیادی عقاید ونظریات تک سے بدظنی عام ہو جاتی ہے یا پھر اپنی ہستی اور وجود تک کو فنا کر دینے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی ہے۔

مسلم قوم میں ابھی اس درجہ ضبط کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی ہے کہ وہ قانون جزئیات و فروع میں آفاقیت کے تصور کر جذب کر سکے بدقسمتی سے مسلم ممالک کی ترقی میں اسلام سے کہیں

زیادہ قومیت کا عنصر پایا جاتا ہے اس لیے بین الاقوامی فقہ کو بروئے کار لانے کے لیے ماحول سازگار رہے نہ مفید نتیجہ کی توقع بلکہ اور الٹے مضر اثرات کا قومی اندیشہ ہے۔

اس لیے موزوں صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس ملک میں جو فقہ رائج ہو اس کو سامنے رکھ کر جدید تدوین کا کام کیا جائے البتہ جن مسائل مین حالات و تقاضہ کے مطابق تبدیلی کرنی پڑے یا نئے مسائل کو حل کرنے کی صورت ہو تو ایسے مواقع میں دوسری فقہ یا اختلاف فقہاء سے ضروری مدد لی جائے کیونکہ اس کے بغیر اس کی کوئی اور آسان شکل نہیں ہے''۔[۴۱]

مولانا کے ذہن میں اسلامیات کی تدوین جدید کا نقشہ ہے اس کی عملی شکل میں اجماع اور اجتہاد کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مولانا کے نزدیک اجماع اور اجتہاد کو فعال اور متحرک بنائے بغیر تدوین جدید کا کام ممکن نہیں ہے۔ اس اجماع کی نوعیت کیا ہوگی اس کی تفصیلی شکل تو آگے آئے گی یہاں اس کے اجمالی پہلو کو سمجھنا لازم ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

''جدید تدوین کو قابل عمل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اجماع کو متحرک اور جاندار بنایا جائے۔ اسلامی قانون میں یہ اصول جس قدر زیادہ اہم ہے اسی قدر مختلف حالات کی بنا پر اس سے بے توجہی بھی برتی گئی ہے۔ شخصی حکومت کے زمانے میں اس بنا پر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی کہ حکومتیں عموماً اس قسم کا کوئی ادارہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہیں۔ جو ایک طرف تو حالات و مسائل میں آزادانہ غور و فکر اور فیصلہ کا حامل ہو اور دوسری طرف عمومی رجحان کو مایل کرنے کی اس میں طاقت بھی ہو۔

دراصل اس سیاسی مفاد کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں اجماع جیسے اہم اصول کو بروئے کار لانے کا موقع نہ مل سکا اور بعد میں یہ خیال عام ہو گیا کہ اجمام میں چونکہ جمعیت کا اتفاق ہونا چاہیے اور یہ صورتحال تقریباً ناممکن ہے اس لیے اجماع کا انعقاد بھی ناممکن ہے۔ حالانکہ شاہ ولی اللہ محدث

دہلویؒ فرماتے ہیں:

''اصل ثالث از اصول شریعت اجماع است باز اجماعیکہ متخیل اہل زبان است بمنی اتفاق جمیع امت مرحومہ بحیثیت لایشذ فرد واحد نصاً من کل واحد منہم خیال محال است ہرگز واقع نہ شدہ اجماع کثیر الواقوع اہل است از مفتیان امصار این معنی در مسایل مصرحہ فاروق اعظم یافتہ می شود کہ اہل حل عقد برآں اتفاق کردہ اند''۵؎

ترجمہ:- اصول شریعت کی تیسری بنیاد اجماع ہے۔ حالانکہ اجماع اس مفہوم میں کہ تمام امت مرحومہ کا کس مسئلہ میں اجماع ہوجائے اور ایک فرد کی رائے بھی اس مسئلہ میں الگ نہ ہو اس معنی میں اجماع ناممکن الوقوع ہے اور کسی زمانے میں بھی واقع نہیں ہوا۔

البتہ جو اجماع بکثرت واقع ہوا ہے وہ مفتیان امصار میں سے اہل حلّ وعقد کا کسی بات پر اجماع ہے انہی معنوں میں فاروق اعظم اہل حل عقد کے اجماع اور اتفاق کو اجماع مانتے تھے۔

اس لیے مولانا کے نزدیک بھی اجماع کی ممکن العمل صورت یہی ہے کہ ممکن العمل قانونی معاملات میں اہل حل وعقد کی ایک مجلس مشاورت قائم ہو اور وہ حالات مسایل پر غور وفکر کے بعد اس کا صحیح حل تجویز کرے جو ایک طرف کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور دوسری طرف ضروریات زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے والا اور دشواریوں پر قابو پانے والا ہو یہ مجلس مشاورت پرئیوٹ اور نجی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ حکومت کی نگرانی میں زیادہ توقع نہیں کہ ازادنہ غور فکر کا پورا موقع مل سکے گا۔ پھر قدیم تدوین کے موقع پر بھی یہ کام نجی طور پر ہی کیا گیا تھا۔ لیکن اگر پرائیوت اور نجی مشاورت اہل حل وعقد ممکن نہ ہو سکے تو اہل افراد کے انتخاب میں کم از کم اس امر کا ضرور لحاظ رکھا جائے کہ حکومت زدہ افراد اس سے علیحدہ رکھے جائیں۔ ایسے افراد کی شناخت اُن کے گذشتہ علمی اور عملی کاموں سے کی جاسکتی ہے۔

پھر جدید تدوین کا یہ کام ''روح اجتہاد'' کے بغیر قطعی انجام نہیں دیا جاسکتا۔مگر ایسے افراد آئیں گے کہاں سے جو اس اہم ذمہ داری کو سرانجام دے سکیں جبکہ موجودہ دور میں وہ طبقہ جو فقہ میں اجتہاد کا داعی اور روح رواں سمجھا جاتا ہے وہ اس کے نشیب وفراز سے واقف نہیں ہے اور دوسرا طبقہ جسے تھوڑی بہت اس فن سے واقفیت ہے بھی تو اس کی نظر میں عملاً اجتہاد کا دروازہ ایسا بند ہو چکا ہے کہ اس کی کنجی تک گم ہو چکی ہے۔پھر اس مسئلہ کا کیا حل ہو۔مولانا فرماتے ہیں:

> فقہا نے اجتہاد کے لیے کافی سامان فراہم کر دیا ہے،اصول وضابطے مقرر کیے اس کام کا راستہ اور طریقہ بتایا ہے،کام کر کے بھی دکھایا ہے یہ سب کچھ ایک مرتب اور مدون شکل میں موجود اور محفوظ ہے۔اس سے زیادہ ہماری محرومی اور بے بصری اور کیا ہو گی اگر اس ذخیرہ سے فایدہ اٹھانے کو اہم جرم سمجھیں یا خود فریبی میں مبتلا ہو کر اس کی اہمیت ہم محسوس نہ کریں۔[۶]

وہ مواد کیا ہیں اور وہ اصول وضابطے کون سے ہیں جن سے فقہ کی تدوین جدید میں مدد لی جاسکتی ہے۔مولانا کے نزدیک یہ درج ذیل ہیں:

۱-قرآن کریم موقع ومحل کی تعین میں سیرت نبوی ﷺ اور عہد صحابہؓ سے استفادہ ۲-حدیث (اور اس سلسلہ میں روایت اور درایت دونوں سے کام لینا) ۳-اجماع ۴-قیاس ۵-استحسان ۶-مصالح مرسلہ استصلاح ۷-استدلال ۸-تعامل ۹-عرف ورواج ۱۰-مسلمہ شخصیتوں کی رائیں۔۱۱-ملکی قوانین جن سے کس شرعی اصول یا کلیہ پر زد نہ پڑتی ہو۔۱۲-فقہی اصول اور کلیات ۱۳-فقہی احکام میں تخفیف وسہولت کے اسباب ۱۴-اختلاف فقہا کے اسباب۔

یہ وہ مواد ہیں جن سے فقہ کی جدید تدوین میں مدد لی جاسکتی ہے۔مگر ان مواد کے سلسلہ میں تھوڑی سی توضیح میں لازم ہے۔

واضح رہے کہ ابتداء میں فقہ کے صرف دو ماخذ تھے۔قرآن مجید اور تشریحات نبوی۔یہی

دونوں اصل ہیں جن کے ذریعہ شرعی قوانین کو منضبط اور مدون کیا گیا۔ ایک تیسرا جز جسے ہم اجماع صحابہ کہہ سکتے ہیں جس نے بعد کے مسائل و قضایا کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں فقہ کی توسع کا کام کیا۔ یہ وہ جماعت تھی جس کی تربیت خود رسول ﷺ کی نگرانی میں ہوئی تھی اور جو نظام اسلامی کے نوک پلک اور اس کے حلال و حرام کی خوب سمجھ رکھتے تھے اور تمدن کی وسعت اور مسائل کی کثرت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان مسائل کو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں حل کیا جائے ورنہ اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ قیامت تک کے لیے انسانی مسائل کو حل کرنے کا ذمہ دار ہے باطل ہو جاتا۔ چنانچہ زمانہ کے اسی چیلنج کو سامنے رکھ کر اجماع کے ساتھ قیاس یا رائے کا بھی اضافہ ہوا جسکا تذکرہ بحیثیت وسیلہ اور ذریعہ خود قرآن مجید اور احادیث صحیحہ و ثابتہ میں موجود تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام جو اس پیغام کے اصل محافظ اور امین تھے انہوں نے اس بات کی ذمہ داری محسوس کی کہ فقہ کے دامن کو وسیع کریں اور بعد والوں کے لیے وہ سرمایہ جمع کر دیں جو رہتی دنیا تک ان کا رہنما ہو۔

پھر رائے یا قیاس کے استعمال کی حد کیا ہو، ظاہر ہے اس کو بے لگام چھوڑ دینا شریعت اسلامیہ میں بہت بڑے فتنہ کو ابھارتا تھا، چنانچہ اس کے قواعد وضوابط منضبط کیے گئے اور وہ اصول و قوانین مرتب کیے گئے جو بعد والوں کو خصوصاً اہل عجم کو بے لگام نہ ہونے دے جن کو بنیادی طور پر نبی ﷺ اور اصحاب نبی ﷺ سے ملاقات اور مصاحبت کا وہ شرف نہ حاصل ہو سکا جو ان کے اندر اس تمدن کی روح کو جاگزیں کر سکتا تھا چنانچہ ضروریات زندگی کے مطابق قیاس کے قانونی دائرے کی توسیع کرتے ہوئے استحسان اور اس استصلاح وغیرہ کے اصطلاحات استعمال کیے گیے۔ یہ زمانہ ۱۴۱ھ کے آس پاس کا ہے جب ابھی دور خلافت ختم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد فتوحات کی کثرت کی بنا پر جب دیگر ملکوں اور قوموں سے معاملات پیش آئے اور ضروریات و مسائل میں اضافہ ہوا نیز علمی ترقی اور یونانی علوم وفنون کی شمولیت کی وجہ سے خیالات من وسعت پیدا ہوئی تو فقہ کے دامن کو مزید وسیع کرنا ناگزیر ہو گیا تو مختلف اُن قانونی ماخذ کا استعمال بھی ضروری قرار پایا

جن کا ثبوت قرآن مجید اور تشریحات نبوی میں جو موجود تھا، غرض اس طرح کے مختلف مراحل سے گذر کر فقہ کی تدوین کا اہم کام تکمیل کو پہونچا۔

تدوین فقہ کی مذکورہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عصری رجحانات اور معاشرتی احوال کو فقہ کی وسعت وترقی میں کافی دخل رہا جیسے جیسے ضرورتیں پیدا ہوتی گئیں فقہ کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ اور زندگی کی ضرورتوں سے آنکھیں بند نہیں رکھی گئیں بلکہ نئے حالات وواقعات کو شریعت کی کسوٹی پر کس کر انہیں نئے زاویہائے نگاہ دینے کی کوشش کی گئی۔

مذکورہ مواد کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ اور اُن سے فایدہ اٹھانا ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ کیونکہ نئے سماجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل منھ پھاڑے کھڑے ہیں ان تمام امور میں غور و فکر کر کے انہیں ضروریات زندگی سے ہم آہنگ بنانے کی سخت ضرورت ہے تاکہ زندگی اور قانون کے درمیان صحیح ربط پیدا کیا جاسکے۔ ورنہ زمانہ کا مفتی اسلام کو فرسودہ قرار دینے میں دیر نہیں لگائے گا اور ان مسائل میں اپنا رنگ بھر کر زمانہ کو اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور کردے گا اور ہماری غفلت اور سہولت پسندی ہمیں بہت بھاری پڑے گی۔ مولانا مرحوم کے نزدیک ان مسائل پر غور کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا سخت ضروری ہے۔

۱- ہر دور میں توجہ اور نظر ثانی کے مستحق وہ مسائل ہوتے ہیں جن کے بغیر معاشرتی نظام نہیں چل سکتا یا اگر چل جائے تو قومی اور ملی ضرر کا سخت اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسے تمام مسائل فوری توجہ کے مستحق ہیں اور غور وخوض میں ان کو اولیت حاصل ہونی چاہیے۔

۲- ہر ملک اور قوم کے حالات مختلف ہوتے ہیں ان کی ضروریات بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمیں واقعیت پسند بننا ہوگا اور انہیں مسائل پر از سر نو غور کرنا ہوگا جن کی قوم وملت کو واقعی ضرورت ہو۔ اور جن کے حل نہ ہونے سے زندگی میں واقعی خلا محسوس ہو۔

۳- مذہبی قانون کے بقاء واستحکام کے لیے اسکی عظمت وتقدس کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ

اس کے بغیر قانون کا احترام نیز اس میں وہ جاذبیت پیدا نہ ہوسکے گی جو قانون کا خاصہ ہے۔ ے

اور ظاہر ہے کہ یہ کام تنہا ایک شخص کی استطاعت سے باہر ہے اس لیے اس کام کے لیے اہل علم کی باضابطہ ایک کمیٹی ہونی چاہیے تاکہ اسے عوام میں وقار و استناد حاصل ہوسکے۔ اس مجلس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اجتہادی امور میں وسعت اور ضبط سے کام لے اپنے مسلک کے علاوہ دوسرے ائمہ سے استفادہ کو حرام نہ جانے ہر مسئلہ کو دلیل اور بصیرت کی روشنی میں پرکھے اور فیصلہ کرے مختلف اقوال کے درمیان ترجیح کے باب میں حالات و مقامات کی رعایت کرتے ہوئے مقررہ قواعد ضوابط کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر کسی مسئلہ میں نص صریح یا تعلیل صحیح متقدمین سے نہ مل سکے تو خود تحقیق و تفحص کے بعد کمیٹی دلایل کی روشنی میں کسی قول کو اختیار کرے مجلس کو اس کام کی انجام دہی کے لیے مذکورہ فقہی مواد سے استفادہ کی صورتیں مختصراً اس طرح ہوں گی:

۱- قرآن مجید کی آیات احکام کے موقع و محل کی تعین اور اس سلسلہ میں سیرت نبوی اور عہد صحابہ سے استفادہ۔

۲- احادیث کے سلسلہ میں روایت اور درایت دونوں امور کا لحاظ۔

۳- اجماعی مسائل کے انداز اور ان کے نوک پلک کو سمجھنا۔

۴- قیاس میں حکمت و علت کے امتیاز کو برقرار رکھنا اور استنباط مسائل میں ہر ایک کے کردار سے واقف ہونا۔

۵- قانونی مآخذ استحسان، استصلاح اور استدلال سے مسائل کے استنباط میں اس امر کو ملحوظ رکھنا کہ متقدمین نے ان سے کس وقت کام لیا اور کن اسباب کی بنا پر یہ مآخذ قرار پائے۔

۶- تعامل اور عرف و رواج کو استعمال کرنے کے لیے فقہا کے طریقوں اور ضابطے کو ملحوظ رکھنا۔

۷- ملکی قوانین جن سے کسی شرعی اصول و ضابطہ پر زد نہ پڑتی ہو اُن سے استفادہ میں اس توسیع

اور ذہنی فراخی کے نمونہ کو پیش نظر رکھنا جسے صحابہ کرامؓ نے مختلف ملکوں کے قوانین کے باب میں اختیار کیا تھا۔

۸- فقہی اصول وکلیات سے استدلال کے باب میں فقہاء کے طرز عمل کو رہبر بنانا۔

۹- فقہی احکام میں تخفیف وسہولت کے اسباب کو برمحل منطبق کرنا۔

۱۰- اختلاف فقہاء کے اسباب پر گہری نظر رکھنا اور حالات کا صحیح تجزیہ کر کے اُن سے فایدہ اٹھانا۔

مجموعی حیثیت سے مندرجہ بالا امور کا ادراک اور اُن کے صحیح استعمال سے کسی بھی زمانہ کے حالات اور مسائل کو بہتر انداز میں حل کیا جاسکتا ہے۔ بالخصوص اجماع اور قیاس یہ دو ایسے اصول ہیں جو ہر زمانہ کی سماجی خرابیوں اور نئے پیدا شدہ حالات ومسائل کو حل کرنے میں بھر پور معاون ہیں۔

یہاں پر ایک شبہ کا جواب دینا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق دین مکمل ہو چکا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

الیوم اا کملت دینکم وأتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔۸

یعنی آج ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا تمہارے لیے اور تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کا اتمام فرما دیا اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند فرمالیا۔

اب اس صورت میں سوال اٹھتا ہے کہ جب دین مکمل ہو چکا ہے تو مزید غور وفکر اور استنباط و استخراج مسائل کی کیا ضرورت ہے۔ اسکا جواب علما نے یہ دیا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن مجید میں ہر نئے پیش آمدہ مسائل کا تفصیلی تذکرہ موجودہ ہے جیسا کہ صاحب التلویح فرماتے ہیں۔

لاادراج حکم کل حادثۃٍ فی القرآن۔ ۹

یعنی ہر واقع ہونے والی چیز کا اندراج قرآن مجید میں نہیں ہے۔

اس طرح صاحب نورالانورافر ماتے ہیں۔

ان الاحکام التی ثبت بصریح الوحی بالنسبة الیٰ الحوادث الواقع قلبل غایة القلة فلولم یعلم احکام تلك الحوادث مل الوحی الصریح بقیت احکامها مهملة لایکون الدین کاملة فلابدمن ان یکون للمجتهدین ولایة استنباط احکامها۔ [۱۰]

ترجمہ: اس میں شبہ نہیں کہ جواحکام صریح وحی سے ثابت ہیں وہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کے مقابلہ میں نہایت کم ہیں اگران کا حکم وحی صریح سے بذریعہ استنباط نہ معلوم کیا جائے تو یہ مہمل پڑے رہ جائیں گے اور دین کے کمال کا دعویٰ بیکار رہ جائے گا اس بنا پر ضروری ہے کہ مجتہدین کواحکام کے استنباط کا اختیار دیا جائے۔

ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ دین کے کامل ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات کا ذکر موجود ہے بلکہ ہرزمانہ میں حالات ومسائل کے مطابق مجتہدین حل طلب مسائل کواس کے مناسب باب سے متعلق کر کے نظائر تلاش کریں گے پھر اس کی روح اور مقصد کوسامنے رکھ کر مقررہ قاعدوں کے مطابق بالترتیب قرآن وسنت اجماع وقیاس سے اس کا تعلق جوڑیں گے۔ بعض صورتیں ایسی ہوں گی جس کا حال آسان ہوگا صرف اصول و کلیات اورضرورت ومصلحت میں صحیح تطبیق سے اُن کا حال نکل آئے گا اور بعض میں دشواری پیش آئے گی اورایسی حالت میں اختلاف ائمۃ سے فائدہ اٹھانے کی بھی ضرورت پڑے گی لیکن ہرحال میں روح اور مقصد سامنے رکھنا ضروری ہوگا نیز فقہی ضابطہ سے انحراف جائز نہ ہوگا ورنہ شریعت ہو س اورسہل پسندی کا ''بازیچہ'' بن کررہ جائے گی۔

مجتہدین کی اس مجلس کوکیا کام کرنا ہوگا مولانا مرحوم کے نزدیک اس کے درج ذیل پہلو ہوسکتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

مجلس کو درج ذیل قسم کے کام انجام دینے ہوں گے:

۱- مسلم پرسنل لاء کے ان مسائل کی فہرست تیار کنا جن میں حالات کی تبدیلی اور سماجی خرابیوں کی بنا پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۲- پرسنل لاء پر عمل درآمد کے لیے سماجی خرابیوں اور ان کے ازالہ کی تدبیروں پر غور وفکر کر کے عملی قدم اٹھانا۔

۳- اُن رسوم سے متعلق حکم شرعی کا اظہار جنھوں نے مسلمانوں کے خانگی زندگی کو نہایت دشوار و عذاب جان بنا دیا ہے اور ان کے ازالہ کے لیے شرعی، اخلاقی اور قانونی کوشش کرنا۔

۴- نئے پرسنل لاء کی تدوین اور اس کو منظور کرنے کی کوشش کرنا۔

۵- پرسنل لاء کو نافذ کرنے کے لیے شرعی حاکم کے لیے جدوجہد۔

۶- جدید مسائل کی فہرست مرتب کر کے ترتیب اور ان کو حل کرنا۔[11]

مولانا مرحوم کے نزدیک فقہ کی یہ تدوین کس قدر اہم تھی اور وہ اسے امت کے لیے کس قدر ضروری خیال کرتے تھے اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

''اگر جدید مسائل حل کرنے کی طرف فوری اجتماعی قدم نہ اٹھایا گیا تو مذہبی طبقہ مذہب سے مایوس ہو جائے گا یا پھر اپنے کو مذہب کی خود ساختہ تعبیر کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگا یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھے لیکن افسوس ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر اب تک نہ ہو سکے، یہ غالباً آخری وقت ہے۔ اور اب بھی کام میں سابقہ وجوہ حائل بنے رہے تو قوم وملت کا اتنا عظیم خسارہ ہوگا کہ اس کی تلافی کی کوئی امکانی صورت نظر نہیں آتی اور قیامت کے دن جب ہم سے یہ باز پرس ہوگی تو ہماری ساری خوش فہمیاں بے نتیجہ اظہار معذرت میں تبدیل ہو جائیں گی اور کوئی بات بنائے نہ بن سکے گی۔[12]

بہر حال یہ وہ سوز دروں ہے جو مولانا کے دل میں موج زن تھا اور اس جذبہ نے تدوین فقہ جیسے مشکل کام کے لیے انہیں آمادہ کیا اور اپنی بساط بھر انہوں نے اس کارنامہ کو انجام دینے کوشش کی فجزاہ اللہ جزاء حسناً۔

(۲) اجتہاد

فقہ کے میدان میں مولانا کی دوسری بڑی خدمت اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی طرف پیش قدمی ہے۔ مولانا کے نزدیک اجتہاد فقہ اسلامی مین ''روح'' اور سرچشمۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے بے نیاز ہو کر نہ مجموعہ فقہ اپنا وظیفہ ادا کرسکتا ہے اور نہ اسے زندہ جاوید کا مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ ''اجتہاد'' کی اس اہمیت کے باوجود ایک طویل مدت سے فقہ اسلامی میں اس کا دروازہ بند کیا جاچکا تھا۔ مولانا نے نہ صرف اس بند دروازہ کے کھولنے میں پیش قدمی کی بلکہ بدلائل قاطعہ یہ ثابت کردیا کہ اصولی اور بنیادی حیثیت سے ہدایت الٰہی کی تکمیل اور دین کی بہت ساری جزئیات کی تشریح کا جتہاد بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم یہاں اس مسئلہ کی تھوڑی سی تفصیل میں جائیں گے تاکہ معلوم ہو کہ اجتہاد کیا ہے؟ اس کی اہمیت دین مین کیا ہے۔ کار اجتہاد کی شرایط کیا ہیں اور اس کے لیے کس درجہ کی صلاہیت درکار ہے اور موجودہ دور میں اس سے غفلت ولاپرواہی کن نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔

۲- اجتہاد کی تعریف

لفظ اجتہاد جہد سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے سخت کوشش، جدوجہد اور محنت کرنا ہے چنانچہ عربی میں یہ محاورہ ہے اجتہد فی حمل الرحیٰ یعنی چکی کا پاٹ اٹھانے میں اس نے محنت کی اسکے برعکس مشقت قلیلہ کے لیے اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے مثلاً یہ کہنا کہ اجتھد فی حمل خردلۃ یعنی رائی کا دانہ اٹھانے میں اس نے جدوجہد کی۔[۱۳۱]

اصطلاح میں اجتہاد کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

هـو استـغـراغ الجهد و بذل غاية الوسع امافی ادراك الاحكام الشرعية واماً فی تطبيقها۔ ۱۴؎

حل طلب صورت کی دریافت میں بالکل خالی الذہن ہوکر انتہائی جدو جہد کرنا یہ صورت نئے قانون کی دریافت کی ہو یا قوانین میں باہمی تطبیق کی ہو دوسری جگہ ہے:-

استفراغ الجهد فی ادراك الاحكام الشرعيه الفرعية من دلّتها الفصيليه الراجعةُ كلياتها الىٰ اربعة اقسام الكتاب والسنة والاجماع والقياس۔ ۱۵؎

یعنی قوانین شرعیہ کی دریافت میں پوری محنت اور جدوجہد صرف کرنا یہ دریافت تفصیلی دلائل سے حاصل ہوتی ہے ان دلائل کا مرجع کتاب وسنت اجماع اور قیاس ہیں۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کی اجتہاد کے لیے اصلاً دو مقامات ہیں۔

اولاً وہ مسائل جن کا حل موجود نہیں ہے اُن کا حل دریافت کرنا ثانیاً وہ مسائل جن کے حل موجود ہیں ان کے لیے موقع ومحل متعین کرنا۔

غالباً اس بنا پر اجتہاد کی دو قسمیں کی گئیں ایک اجتہاد تام جس میں فقیہ غور وفکر اور تحقیق وجستجو کی اپنی انتہائی کوشش صرف کرتا ہے دوسرے اجتہاد ناقص جس میں حکم تو موجود ہوتا ہے بس اس کی شناخت اور موقع ومحل کی تعین پیش نظر ہوتی ہے۔ ۱۶؎

مولانا فرماتقی امینی صاحبؒ فرماتے ہیں:

''زمانہ کی کروٹوں اور نئی نئی ضرورتوں نے ایسے حالات مسایل پیدا کر دیے ہیں جن کا فقہ میں کوئی تذکرہ نہیں ہے البتہ اصولی اور عمومی رنگ میں ہدایت الٰہی ان سب کو شامل ہے مثلاً موجودہ دور کے مالیاتی وسماجی نظام نے بہت سے مسائل مثلاً کمرشیل انٹرنسٹ انشورنس، کواپریٹو سوسائیٹیاں وغیرہ، ایسے پیدا کر دیئے ہیں جس

میں غور وفکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنا اور مذہبی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے قوم و ملت کی رہنمائی کرنا ہے۔ ۱۷

اجتہاد کی ضرورت تو ہر دور میں رہی ہے مگر موجودہ عہد میں اس کی ضرورت کچھ زیادہ شدت اختیار کرگئی ہے ادھر بد قسمتی سے چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا یہانتک کہ امام رافعیؒ کے قول کے مطابق:

الخلق کالمتفقین علیٰ انه لامجتهد الیوم۔ ۱۸

یعنی گویا خلق خدا کا جیسے اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی مجتہد سرے سے ہے ہی نہیں۔

اس سلسلے میں جو دلایل پیش کیے گیے وہ کچھ اس طرح کے تھے مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ فرمان:

ایُّ سماءٍ تظلنی ایُّ ارضٍ تقلنی اذا قلت فی کتاب الله برائی ۔یعنی کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھ کو اٹھائے اگر میں اللہ کی کتاب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں گا۔

یا مثلاً حضرت عمر کا یہ ارشاد کہ:

ایاّ کم و اصحاب الرأی فهم اعداء لأهل السنن أعیتهم الاحادث ان یحفظو ها فقالو بالرائی۔

لوگو اصحاب الرائی سے خبردار رہنا کیونکہ یہ لوگ سنتوں کے دشمن ہیں یہ لوگ حفظ حدیث میں عاجز رہ جانے کی وجہ سے رائی سے اپنی بات کہتے ہیں مثلاً یا حضرت علیؓ کا یہ قول کہ:

لو کان الدین یو خذ قیاساً لکان باطن الخف اولیٰ بالمسح من ظاهره۔

یعنی اگر دین کے اصول وضوابط قیاس سے ماخوذ ہوتے تو موزے کے نچلے حصہ پر مسح کرنا

اوپر کے حصہ پر مسح کرنے سے بہتر ہوتا۔

یا مثلاً حبر الامہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا اظہار تشویش بایں الفاظ:

یذهب قرائکم و صلحاء کم و یتخذ الناس رؤوساً جهالا یقیسونالامور برأیهم

یعنی تمہارے اہل علم اور صلحاء رخصت ہو جائیں گے اور لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور وہ معاملات میں اپنی رائے سے قیاس کریں گے۔

مذکورہ بالا اقوال و آرا سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دین میں قیاس ورائے باطل ہے حالانکہ ایسا کہنے والے یہ بات بھول گئے کہ خود قرآن مجید اور تشریحات نبویہ کے مطابق قیاس واجتہاد کی نہ صرف صراحت ہے بلکہ اسے عملاً برتنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور جہاں تک ان آراء کا تعلق ہے جو مختلف صحابہ کرامؓ کی طرف منسوب ہیں ان کا صحیح محل یہ ہے کہ اگر اس کے مقابلہ میں نص صریح موجود ہو تو ایسی رائے تو قیاس باطل ہے البتہ جہاں سرے سے نص ہی موجود نہ ہو تو اُن مواقع پر رائے قیاس اور اجتہاد لازم اور ضروری ہیں جن کی مثالیں خود مذکورہ صحابہ کرامؓ کے یہاں پائی جاتی ہیں مثلاً حضرت ابوبکرؓ کا زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کر کے مانع زکاۃ سے جہاد کا فتویٰ دینا اسی طرح حضرت عمرؓ کا مفتوحہ ممالک کی آراضی کا مجاہدین میں تقسیم سے انکار کرنا نیز اُن کے متعدد فیصلے اس رائے اور قیاس کے بدولت ہی کیے گئے۔

اور جہاں تک قیاس کے استعمال میں نص صریح کا تعلق ہے تو اس کی متعدد مثالیں ہم گذشتہ صفحات میں قیاس کی بحث میں پیش کر چکے ہیں یہاں کچھ اور مثالیں پیش خدمت ہیں۔

اجتہاد کے ثبوت میں قرآن مجید کی درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

فاعتبروا یا اولی الابصار [19]

پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو۔

اس میں لفظ اعتبار استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے۔ الاعتبار ھورد الشئ

الیٰ نظیرہ ۲۰

یعنی شیٔ کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا یعنی جو حکم اس شیٔ کا ہے اس کے نظیر پر بھی وہی حکم لگانا۔

اس سلسلہ کی دوسری آیت ملاحظہ ہو۔ اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے۔

ومن حیث خرجت فول وجھك شطرالمسجد الحرام وحیث ما کنتم فولو وجوھکم شطرہ ۲۱

اور جہاں سے بھی آپ نکلیں تو اپنا رخ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور جہاں بھی تم رہو اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرلیا کرو۔

یہ آیت اُن لوگوں کے سلسلہ میں ہے جو مسجد حرام سے فاصلہ پر ہوں ایسی صورت، میں وہ اپنا رخ مسجد حرام کی طرف (نماز کے وقت) کرلیا کریں اور ظاہر ہے کہ یہ کام اجتہاد اور ظن وتخمین کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب نماز میں اجتہاد کا حکم ہوگیا ہے تو دیگر معاملات میں تو بدرجہ اولیٰ اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔

ان آیات کے علاوہ متعدد آیات ہیں جن میں نقد اور بصیرت سے کام لینے اور معاملات کی خبر اولی الامر تک پہونچانے کی بات کی گئی ہے تاکہ وہ اجتہاد و استنباط سے کام لے کر پیش آمدہ مسائل سے نمٹ سکیں۔

قرآن مجید کے بعد آئینے سنت رسول کی طرف رجوع کریں اس سلسلہ میں حدیث معاذ کو ہم پیچھے پیش کر چکے ہیں۔ اس پر بعض ناقدین حدیث یہ الزام لگاتے ہیں کہ حدیث کی سند ضعیف ہے مگر اس کا جواب حافظ ابن قیمؒ اور امام ابن العربیؒ وغیرہ نے یہ دیا ہے کہ اگر روایتی اعتبار سے اسکو ضعیف تسلیم کر بھی لیا جائے تو درایتاً یہ کمزور نہیں ہے کیونکہ قرآن کریمؐ کی متعدد آیات سے نیز دیگر متابعات وشواہد سے اس حدیث کی تائید ہوتی ہے۔ دوسری احادیث جن سے حدیث معاذ کی تائید ہوتی ہے درج ذیل ہیں:

اذاحکم الحاکم فاجتھدتم اصاب قلے اجران واذاحکم فاجتھد تم اخطاقلبه اجر [۲۲]

یعنی حاکم نے جب اجتہاد سے فیصلہ کیا اور درست کیا تو اُسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر غلط فیصلہ کیا تو ایک اجر ملتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے۔

اذا قضی القاضی فأجتھد فأصاب فله عشرة اجورو اذا اجتھد فأ خطأ کان له اجر او اجران [۲۳]

ہمارے نزدیک صحیح قول یہ ہے کہ جب رسول ﷺ کو کوئی ابتلاء پیش آتی تھی جس میں وحی نازل نہ ہوئی ہوتی تو آپ وحی کا انتظار فرماتے لیکن جب انتظار کی مدت گذر جاتی تو رائے یا اجتہاد سے حکم ظاہر فرماتے تھے پھر اگر اس کے خلاف وحی نہ آتی تو اسے برقرار رکھتے اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ فیصلہ میں حجت فاطعہ وہی رائے ہے۔

مذکورہ دلایل سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ اجتہاد کا دروازہ خود رسول اکرم ﷺ نے کھولا تھا اور اس سلسلہ میں جو کام آپ ﷺ نے کیے اس کی تفصیل مولانا تقی امینی نے یوں بیان فرماتے ہیں:

۱۔ قرآنی مفاہیم کی توسیع کی مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ:

یاایھاالذین امنو الاتاکلو اموالکم بینکم بالباطل الاان تکون تجارة عن تراض منکم [۲۴]

اے ایمان والوں آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نا کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی رضامندی سے تو اجازت ہے۔

اس میں دو اصول بیان کیے گیے ہیں کہ ایک سلبی اور دوسرا ایجابی، پہلے میں ناحق کسی کا مال

کھانے کی ممانعت ہے اور دوسرے میں حق کے ساتھ باہمی رضا مندی سے اجازت ہے ان دونوں کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ نے مروجہ معاملات کا جائزہ لیا اور ان سب کو ناجائزہ قرار دیا جن میں دھوکہ پایا جاتا تھا اور بالآخر ناحق مال کھانے کی شکل نکلتی تھی عرب میں خرید وفروخت کی مروجہ بہت سی شکلیں ان دونوں اصول کے تحت جائز یا ناجائز قرار پائیں مثلاً خریدار و بائع (بیچنے والا) کسی چیز کا بھاؤ کرتے تھے اور دیکھنے و طے ہونے سے پہلے خریدار یا تو اس کو چھو لیتا یا بیچنے والا خریدار کی طرف پھینک دیتا، یا خریدار اس پر کنکری رکھ دیتا تو ان سب صورتوں میں بیع مکمل ہو جاتی تھی ان معاملات میں چونکہ فریقین کی رضا مندی موجود تھی اس بنا پر ان کو ایجابی اصول کے تحت آنا چاہیے تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی تشریح وتوضیح نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ جس رضا مندی میں دھوکہ وفریب کا خطرہ ہوا اور خطرہ ظاہر ہونے کے بعد اس رضا مندی کا نتیجہ ناحق مال کھانے کی شکل میں ظاہر ہو تو وہ بھی سلبی اصول کے تحت آئے گا۔

۲- اصل کو فرع پر منطبق کر کے دکھایا جس سے دوسری فرع کا حکم نکالنے میں سہولیت ہوئی اوپر کی آیت اصل ہے اور موجودہ مروجہ معاملات فرع ہیں اصل میں حرمت وممانعت کی علت ناحق مال کھانا ہے یہ علت جتنے معاملات میں پائی جائے گی وہ سب حرام وناجائز ہوں گے خواہ اس وقت موجود ہوں یا بعد میں ہوں، ابتدا میں علت پائی جاتی ہو یا اخر میں ہو جب کہ دھوکہ وفریب ظاہر ہو۔

۳- جزئی قوانین جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں ان کے موقع ومحل متعین کیے جیسے تیمّم، نماز اور قصر کے مواقع بیان کیے اور شرعی رخصتوں کے محل متعین کیے کہ کس جگہ ان رخصتوں پر عمل کرنے کی اجازت ہے۔

۴- قانون کی شرطیں، رکاوٹیں قیدیں وغیرہ بیان کیں جن کے بغیر ان پر صحیح عمل درآمد دشوار

تھا۔مثلاً نکاح، طلاق، خرید وفروخت وغیرہ کی تفصیل جس سے صحیح یا غلط اور حلال وحرام کے درمیان امتیاز قائم ہوا

۵- نئے قوانین بیان کیے جن کا صریح ذکر اگر چہ قرآن میں نہیں ہے لیکن وہ اس کی معنوی دلالت میں موجود ہے، مثلاً پھوپھی کی موجودگی میں بھتیجی سے نکاح یا خالہ کی موجودگی میں بھانجی سے نکاح حرام قرار دیا وغیرہ۔

۶- مطلق آئیتوں کی تفصیل بیان کی اور موقع ومحل کے لحاظ سے ان کو مقید کیا جیسے معروف منکر طیبات اور خبائث کے تحت بہت سی مروجہ چیزوں کا حکم بیان کیا یا جرائم کی سزاؤں سے متعلق آیتوں کو موقع ومحل کے لحاظ سے مقید کر کے ان پر عمل درآمد کو واضح کیا۔

۷- مجمل آیتوں کی تشریح کی جس کے بغیر صحیح مفہوم سے واقفیت اور اس پر عمل وآمد دشوار تھا مثلاً صلوٰۃ زکوٰۃ اور صوم وغیرہ سے متعلق آیتوں کی تشریح کی اور ان کی کیفیت بیان کی۔

۸- جزئی واقعات اور کلی قواعد سے مدد حاصل کر کے نئے قواعد واضع کیے اور ان سے جزئیات مستنبط کر کے دکھایا۔مثلاً۔

لاضرر ولاضرارفی الاسلام ،الضرریزال المشقة تحلب التیسیروغیرہ

اسلام میں نہ نقصان پہونچانا ہے اور نہ نقصان اٹھانا ہے، نقصان دور کیا جائے، مشقت آسانی کھینچتی ہے۔

۹- قرآنی احکام کی وجواہ واسباب اور حکمت ومصلحت کی نشان دہی فرمائی جس سے نئے اصول وکلیات وضع کرنے اور اجتہاد کا دائرہ وسیع کرنے کی سہولت ہوئی۔

۱۰- آیتوں کے شان نزول بیان کیے جس سے زندگی ومعاشرہ کو درپیش مسائل کی نشان دہی ہوئی اور ان پر قیاس واستنباط کے لیے موادفراہم ہوا۔

ان چند مثالون سے ظاہر ہے کہ اجتہاد کا دائرہ وسیع کرنے اور ان کو نمو پذیر زندگی اور ترقی

پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے قابل بنانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی تشریح و توضیح اور آپ ﷺ کے اخذ و استنباط سے استفادہ کی کس قدر ضرورت ہے۔[۲۵]

مذکورہ بالا طویل اقتباس سے یہ اندازہ لگانے میں قطعی دشواری نہ ہوگی کہ خود آنحضرت ﷺ نے اجتہاد کے اصول و قواعد اور ضابطے وضع کیے ہیں اور انہی بنیادوں پر بعد والوں نے احکام و مسائل کی جزئیات کا استنباط کیا ہے۔

پھر آپ کے بعد صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین نے انہیں اصول وضوابط اور قوانین و قاعدوں کا لحاظ کرتے ہوئے اجتہاد کے دائرے کو وسیع کیا اور فقہ کی میراث کو آگے بڑھایا لیکن اجتہاد کا ثبوت پایۂ تکمیل پہونچنے کے بعد بھی یہ صحیح نہ ہوگا کہ ہر شخص کو اجتہاد کی کھلی چھوٹ دے دی جائے بلکہ یہ حق صرف اس کو حاصل ہونا چاہیے جو نہ صرف مقاصد شریعت سے واقف ہو بلکہ موقع و محل کے لحاظ سے نص سے استنباط و استدلال کی قدرت بھی رکھتا ہو چنانچہ امام شاطبیؒ اپنی کتاب الموافقات میں رقم طراز ہیں۔

انما تحصل درجة الاجتهاد لمن اتصف بوصفين احد ها فهم مقاصد الشريعه على كمالها و الثانى التمكّن من الاستنباط بناء على فهمه فيها له۔ [۲۶]

اجتہاد کا درجہ اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس کے اندر دو صفتین پائی جائیں اولاً اعلی درجہ کمال کے مطابق مقاصد شریعت سے واقفیت ثانیاً اس واقفیت کے مطابق مسائل کے استنباط پر قدرت۔

مولانا امینی کے نزدیک مقاصد شریعت سے واقفیت سے مراد علم و حکمت ہے۔ اور علم سے مراد نبوت ہے یعنی اس درجہ کی مناسبت ہو کہ موقع و محل کے لحاظ سے مفہوم کی تعین اور اصول و کلیات کو برمحل منطبق کرنے پر جزئیات و فروع میں ان کو استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور حکمت سے مراد وہ حسن استعداد ہے جو نبوت کی مزاج شناسی کی راہ سے حاصل ہوتی ہے اور اسرار دین اور رموز قوانین تک پہونچاتی ہے۔

پھر مجتہدین کے درجہ ومراتب میں بھی فرق ہوتا ہے۔ظاہر ہے سب سے اونچا مرتبہ انبیاء کا ہوتا ہے اس کے بعد درجہ بدرجہ ان لوگوں کو نمبر آتا ہے جن کو ذوق نبوت سے جس درجہ کی قرابت حاصل ہوتی ہے۔ ۲۷

اجتہاد کے لیے دوسری شرط موقع ومحل کے لحاظ سے استدلال واستنباط کی صلاحیت ہے۔ یہ صلاحیت کیسے پیدا ہوتی ہے اس کی تفصیل مولانا امینی مرحوم نے یوں فرمائی ہے۔

''یعنی ہدایت کے اصول وفروغ میں اتنی مہارت ہو کہ انہیں بنیاد بنا کر مقررہ قاعدہ کے مطابق فقہ کے دامن کو وسیع اور جاذب نظر بنایا جاسکے یہ صلاحیت، مقاصد ومصالح کی تنظیم کے فرائض انجام دیتی ہے اور ان میں ترتیب وتہذیب کے ذریعہ زندگی اور قانون میں تعلق پیدا کرتی ہے۔

فقہاء نے اس کا ذریعہ درج ذیل چیزوں کو قرار دیا ہے:

۱۔ قرآن حکیم: لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کے معانی ومفاہیم پر عبور حاصل ہو۔

۲۔ سنت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کو موقع ومحل پر منطبق کرنے میں مہارت ہو۔

۳۔ اجماع: اس کے طریقوں اور فیصلوں نیز موجودہ ماحول میں ان سے کام لینے کے طریقہ سے واقفیت ہو۔

۴۔ قیاس کی وجوہ اور طریقوں کا علم ہو۔

۵۔ صحابہؓ اور ان کے متبعین کے اقوال وفتاویٰ پر نظر اور ان کے موقع ومحل سے واقفیت ہو۔

۶۔ فقہی اصول وکلیات کا علم اور جزئیات وفروع میں منطبق کرنے کی صلاحیت ہو۔

۷۔ فقہی جزئیات اور ان کے موقع ومحل سے واقفیت ہو۔

۸۔ قدیم عربی زبان میں مہارت ہو۔

۹۔ قومی وملکی مصالح اور حالات وزمانہ کے تقاضہ سے واقفیت بھی ضرورت ہے۔

۱۰۔ وہ علم وادراک بھی ضروری ہے جس کا تعلق قلب سے ہے۔ یہ دراصل ایک باطنی قوت ہے

جو زندگی کو کردار نبوت میں ڈھالنے سے ابھرتی اور عقل کو قلب کی تربیت گاہ میں لے جانے سے سنورتی ہے۔ اصولیین اس کو قلب کی آنکھ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ۲۸؎

یہاں پہنچ کر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عہد موجود میں اجتہاد کا طریقۂ کار کیا ہو؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

طریق اجتہاد کے بارے میں صحابہؓ کرام اور ائمہ مجتہدینؒ کا طرز عمل ہمارے سامنے ہے کہ اجتہادی امور ہیں غور و خوض اور ان کے حل کے لئے صاحب صلاحیت افراد کی ایک مجلس قائم تھی، موجودہ حالات کا بھی تقاضا یہی ہے کہ صلاحیت رکھنے والے افراد کی ایک مجلس قائم کی جائے جس میں مختلف ضروریات کے لحاظ سے ہر ضرورت کے ماہرین موجود ہوں، کچھ افراد نمایاں حیثیت رکھنے والے ہوں اور باقی کی حیثیت مشیر و مددگار کی ہو۔

صورت یہ ہو کہ پہلے حل طلب مسائل کی روح اور مقصد میں غور کیا جائے کہ شارع کے پیش نظر ان کے ذریعہ کس قسم کی مصلحت کا حصول اور کسی قسم کی مضرت کا دفیعہ ہوسکتا ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ ان احکام کو مزاج اور ذہنیت کی تبدیلی سے کتنا تعلق ہے؟ نیز موجودہ معاشرتی حالات اور سماجی زندگی کس حد تک ان کی روح اور اصلی کردار کو جذب و انگیز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ اس بات کی تحقیق بھی ضروری ہے کہ شارع کے پیش نظر ان مسائل کی صرف روح اور معنی مقصود ہیں یا قالب اور صورت بھی مقصود و متعین ہیں۔ اگر دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں تو کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معاشرتی حالت کو تبدریج ان کے قابل بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر یہ مسائل پہلی قسم سے تعلق رکھتے ہیں تو معاشرہ اور تمدنی تبدیلی کے ساتھ ان کی صورت میں تبدیلی ناگزیر ہوگی لیکن ہر حال میں روح اور مقصد نظر انداز نہ ہونا چاہیئے ورنہ مفید نتیجہ کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔ ۲۹؎

مولانا کی نظر میں اجتہاد کی ضرورت شدید ہے اور وقت بہت کم لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز

نہیں ہے کہ اس کام کو ہر کوئی کرسکتا ہے بلکہ یہ کام نہایت ذمہ داری اور نیک نیتی سے کرنے کا ہے اس بنا پر نا اہلوں کے ذمہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ لوگ جو اس کے لئے اہل ہوں انہیں بھی مذکورہ قیود و شرائط کا لحاظ کر کے ہوئے اجتہاد کرنا چاہئے۔ پھر اجتہاد کی اجازت انہیں حالات ومسائل کے اندر ہو جن کی حقیقی معنوں میں ضرورت درپیش ہو۔ اگر اس کا لحاظ نہ کیا گیا تو قوم بنی اسرائیل کی طرح یہ نام نہاد ''اجتہاد'' امت مسلمہ کو عروج وترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے بجائے امت میں بگاڑ اور فساد کا سبب بن جائے گا۔ افراط وتفریط کی راہ چلنے سے اسلامی قانون کی لچک اور زمانہ کا ساتھ دینے کا اس کا دعویٰ باطل ہو جائے گا اور وہ اپنے شاندار ماضی سے کٹ کر رہ جائے گا اور اس کی اولیت اور صالحیت ختم ہی ہو جائے گی۔

بہر حال اسلام کی ترقی وعروج اجتہاد کا بند دروازہ کھولے بغیر ممکن نہیں ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ہماری مجموعی فقہی وراثت اس دور میں بھی ہماری رہنما ہے۔ اس وراثت نے ہمیں اصول اور معیار دیئے ہیں کام کا انداز وطریقہ بتایا ہے بلکہ کام کر کے دکھایا ہے اور اجتہاد کے لئے جس لیاقت اور صلاحیت درکار ہونی چاہئے اس کا نہایت وضاحت اور تفصیل سے بیان ہے۔ اب یہ ہماری محرومی اور بے بصری ہوگی کہ ہم اسلاف کی اس وراثت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں اور موجودہ مسائل میں غور وفکر اور باہمی تعاون کے ذریعہ ان کا حل تلاش کرسکیں۔ اس اجتہاد کا دروازہ اسلام ہمیشہ کھلا رکھنا چاہتا ہے اور اس کی طرف مولانا تقی امینیؒ کی دعوت بھی ہے۔

۳- احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت:

تمہید:- حکمت ودانائی فقاہت کی اولین شرط ہے۔ کوئی فقیہ اس وقت تک صحیح معنوں میں فقیہ کہلانے کا مستحق نہیں ہوسکتا جب تک زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات پر اس کی گہری نظر نہ ہو۔ فقیہ کی مثال اس حکیم یا ڈاکٹر کی ہے جو ایک ہی مرض کے مریض کو دو مختلف حالات میں الگ الگ مشورے دیتا ہے اور دو متضاد طریقوں سے علاج کرتا ہے سردی کے زمانہ میں مریض کو لحاف میں

دبک کر بیٹھتے تو گرمی کے زمانہ میں کھلی چھت پر اوس اور شبنم کے درمیان رات گذارنے کا مشورہ دے گا شوگر کے مریض کو میٹھی چیزوں اور مقویات سے پرہیز کرائے گا تو دیگر امراض میں مقویات اور شیرینی استعمال کرنے کا مشورہ دے گا۔ یہی حکیم حاذق کی پہچان ہے ٹھیک اسی طرح فقیہ حاذق کا بھی معاملہ ہے وہ مختلف حالات وظروف اور احوال واشخاص کا لحاظ کرتے ہوئے شرعی امور میں رہنمائی کراتا ہے یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ نے تفقہ فی الدین کے مفہوم میں درج ذیل باتوں کو شامل کیا ہے۔

۱- آفات نفسانی کی باریکیوں کی پہچان۔

۲- ان چیزوں کی پہچان جو عمل کو فاسد بنادینے والی ہوں۔

۳- راہ آخرت کا علم۔

۴- اخروی نعمتوں کی طرف غایت درجہ رجحان۔

۵- دنیا کو حقیر سمجھنے کے ساتھ اس پر قابو پانے کی طاقت۔

۶- دل پر خوف الٰہی کا غلبہ۔

اور ان تمام شرائط کا استنباط امام صاحب نے آیت قرآنی **لیتفقھوا فی الدین** سے کیا ہے۔ نیز امام صاحب نے فقیہ کی تعریف میں یہ جملہ بھی ارشاد فرمایا ہے **فقیھافی مصالح الخلق فی الدینا**۔ یعنی وہ دنیوی امور میں خلق خدا کی مصلحتوں کا ماہر اور رمز شناس ہو۔[۳۰]

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ **من لم یکن عالما باھل زمانه فھو جاھل**۔[۳۱]

یعنی جو فقیہ اپنے زمانہ کے حالات سے واقف نہ ہو وہ جاہل ہے۔

مذکورہ تشریحات سے ظاہر ہے کہ فقیہ کہلانے کے لئے تحقیق وتفتیش کی ٹھوس صلاحیت، قومی مزاج کی رعایت، مصلحت شناسی سا مہارت، مرض اور مریض کی نفسیات سے واقفیت وغیرہ سبھی لازمی ہیں۔

مولانا تقی امینی صاحب، ان تمام خصوصیات کے حامل تھے اور ان خوبیوں کا بتمام وکمال اظہار ان کی کتاب ''احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت'' سے بخوبی ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی مذکورہ کتاب میں ماضی اور حال کی مسلم امتہ کے حالات کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں۔

جس وقت مسلم قوم قوی اور توانا تھی اس وقت اسے نہ تو جدید غذا کی ضرورت تھی اور نہ ہی موجود غذاؤں کے لئے نئے ڈبے اور پیکٹ درکار تھے بلکہ ملکی اور معاشرتی قوانین کا جوذخیرہ موجود تھا وہ وقت اور موسم کے لحاظ سے کافی تھا اور حسب ضرورت استعمال کرنے میں آزادی تھی۔......

لیکن پھر یہ قوم ایسے حالات سے دوچار ہوئی کہ اس کی زندگی کا سب کچھ لٹ گیا وہ بیمار ہوئی اور یہ بیماری اپنی انتہا کو پہونچ گئی۔لیکن چونکہ اس کی روح میں وحی الٰہی کی آواز سرایت تھی اس بنا پر جان بچانے میں کامیاب ہوگئی۔اس اثنا میں دوسری ضعیف اور ناتواں قومیں اس کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلو سے روشنی اور عبرت حاصل کرکے قوی اور توانا بن گئیں اور زمانہ کا رخ موڑ کر انہوں نے ایک نئے دور کا آغاز کردیا۔اب جبکہ مسلم قوم نے روبصحت ہوکر زندگی میں دوبارہ قدم رکھنا چاہا تو وہ دور ختم ہو چکا تھا جس کا آغاز خود اس نے کیا تھا اور وہ دنیا لٹ چکی تھی جس کو اس نے اپنے ہاتھوں بنایا اور سجایا تھا۔ ۳۲؎

پس چہ باید کرد؟ اب کیا ہو مسلم امتہ کو موجودہ حالات میں کس طرح کی رہنمائی درکار ہے جس سے وہ موجودہ ملکی اور بین الاقوامی تہذیبوں کے درمیان ایک بار پھر اسی سرخروئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوسکے جو اسے ماضی میں کبھی حاصل رہی تھی۔مولانا اس صورتحال کو محسوس کرتے ہوئے اپنی قوم کو درج ذیل مشورے دیتے ہیں۔

مسلم قوم نے جس نئی دنیا میں قدم رکھا ہے اگر اس میں رہنا اور چلنا ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔تو اس کے احساسات وخیالات کو سمجھنا ضروری اور تقاضوں اور مطالبوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے۔حصول مصالح اور دفع مضرت کی بہت سی شاہراہیں تعمیر ہو چکی ہیں۔معاشی اسکیموں

اور فلاحی تجویزوں کا ایک انبار لگا ہوا ہے صنعت وحرفت کی وسیع پیمانہ پر تنظیم ہوگئی ہے اور تجارت وزراعت کی نئے انداز میں تشکیل ہوچکی ہے۔ اور اب بات صرف حاجت وضرورت پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ جلب منفعت اور دفع مضرت کا سوال ہے اور زندہ رہنے کے لئے زندگی کے موجودہ سروسامان سے آراستہ ہونے کا معاملہ ہے۔

ان ملکی وبین الاقوامی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرتی قوانین میں بھی بعض قوانین ایسے ہیں جن کا دور ختم ہو چکا ہے او بعض ایسے ہیں جن کی دنیا لٹ چکی ہے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے لئے نیا قالب تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

نیز موجودہ دور کے بہت سے قوانین اپنے ذخیرے میں شامل کرنے کے لائق ہیں اور بہت سے معاملات کے لئے نئے قوانین بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ ساری چیزیں ترقی یافتہ معاشرہ کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ اور ہر دور اور زمانہ میں دستور سازی کے سلسلہ میں ان مسائل کا لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کسی زمانہ میں ان کا لحاظ نہ کیا گیا تو شریعت اور معاشرہ کا رشتہ منقطع ہوجائے گا۔ اس کے بعد شریعت کے لئے دو ہی شکلیں باقی رہ جائیں گی۔ یا تو شریعت زندگی سے کنارہ کشی پر مجبور ہوجائے گی یا پھر اس کی چاکری میں مشغول رہے گی۔ ۳۳

لیکن کیا مذکورہ تبدیلیوں کو قبول کرنے اور معاشرتی، معاشی، قومی اور بین الاقوامی حالت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لئے ہماری شریعت میں گنجائش ہے؟ اور اگر گنجائش ہے تو اس کے حدود وقیود کیا ہیں؟

ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ ہاں! شریعت کے بنیادی قواعد میں نئے احوال وظروف کے لئے جگہ موجود ہے۔ کیونکہ جب فتوحات کی کثرت ہوئی اور مختلف قومیں اور تہذیبیں حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو وہ اپنے ساتھ اپنا مخصوص معاشرہ اور تمدنی بھی لائیں۔ ان کے اختلاط کی وجہ سے ظاہر ہے مسلم امہ ایک تہذیبی کشمکش سے بھی دوچار ہوئی۔ کیونکہ یہ

تہذیبیں بنیادی طور سے عربوں کی سادگی اور ہدایت پسندی سے متصادم تھیں۔لیکن فقہاء کرام نے اس نئی صورتحال کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسلامی شریعت کی روشنی میں انہوں نے قوموں کی ہدایت اور رہنمائی کے فرائض انجام دئے چنانچہ احکام وقوانین کا جوذخیرہ ہمارے پاس موجودہ محفوظ ہے، اس کی وسعت وتنوع کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہارون الرشید کی سلطنت جو سندھ سے ایشیائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی، وہ انہیں احکام وقوانین پر قائم تھی اور اس دور کے تمام واقعات ومعاملات انہیں کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔

مگر موجودہ حالات میں اسلام کے زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونے کے دعووں اور قرآن وسنت، صحابہ کرام کے فیصلوں اور فقہاء کرام کے کارناموں کے تاریخ میں ثبت ہونے کے باوجود عہد موجود ہیں ان سے استفادے کے سلسلہ میں بڑی دشواریاں ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- **مذہب کا محدود تصور:-** مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہورہی ہے اس میں بڑی حد تک فکروعمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دورزوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پائمال بنادیا ہے اور اس طرح مذہب کا دائرہ کار عقائد وعبادات سے آگے نہیں بڑھ سکا اسی طرح بعض اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں شاذ ونادر انفرادی رایوں سے بھی انکار نہیں ہے لیکن سند قبولیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے یہ رائیں معاشرہ پر اثر انداز نہیں ہوسکی ہیں۔

۲- **حالات وزمانہ کی رعایت کا ناقص تصور:-** ہر سمجھ دار آدمی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ بہت سے ملکی، تنظیمی اور معاشرتی قوانین حالات وزمانہ کی رعایت کئے بغیر اپنی افادیت نہیں برقرار رکھتے ہیں لیکن یہ ''تسلیم کرنا'' صرف زبانی ہے۔شرعی امور میں عملاً اب تک کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکا۔

۳- **تہذیب جدید سے مرعوبیت:-** موجودہ ترقیات اور بدلے ہوئے حالات سے سب

مرعوب ومتاثر ہیں لیکن مرعوبیت اور تاثر کا ظہور دو مختلف طریقوں سے ہورہا ہے۔ ایک طبقہ حدود وقیود کونظر انداز کر کے سب کچھ قبول کرنے میں خوش ہے اور دوسرا ماتم کرنے اور گریز وفرار کی راہ اختیار کرنے میں مگن ہے۔ مضطرب وغیر مطمئن نہ یہ طبقہ ہے اور نہ وہ ہے۔ پھر عدل واعتدال کی ضرورت کس کو پیش آئے؟ اور اس کی راہیں کیونکر کھلیں؟

۴- **عملی اقدام کی کمی:** -عدل واعتدال کی توقع متوسط طبقہ سے ہوسکتی تھی یکن تجربہ سے معلوم ہوا کی متوسط طبقہ کا عملا اب تک وجود نہیں ہے۔ بعض حضرات کی خواہشیں یقیناً قابل قدر ہیں۔ لیکن صرف خواہشیں ہیں جو معمولی آزمائش کے وقت نہایت نیک نامی کے ساتھ دب جاتی ہیں، اور پھر چند دنوں کے لئے ابھرتی ہیں ان خواہشات کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی موثر طاقت ہے اور نا بے چین کر دینے والا احساس۔

۵- **قوت اجتہاد سے محرومی:** یہ کام جرأت وہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہ راست غور وفکر کے بغیر نہیں انجام پاسکتا لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ ان سے صرف نظر کرنے کی جرأت وہمت کے مظاہرہ کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلہ کی امید بیکار ہے۔[۳۴]

بہر حال ان موانع کے باوجود مولانا نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ اس کام کی انجام دہی میں جہاں معذرۃً الٰی ربکم کا پہلو بھی شامل تھا وہیں یہ امید بھی قائم تھی کہ شاید مستقبل میں طوفان کی شدت قلب ودماغ کی لہروں میں ارتعاش پیدا کردے اور پھر ملت کی بقاء وسلامتی کے لئے سفینہ کی تیاری ناگزیر ہو جائے۔

مستقبل میں اگر اسلامی قانون کی صورت گری حالات وزمانہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی تو وہ کن بنیادوں پر قائم ہوگی؟ اور ان کا طریق استدلال کیا ہوگا۔ مولانا کے نزدیک اس کی مندرجہ ذیل

شکلیں ہوسکتی ہیں:

۱- **نسخ:** اس سے مراد موجودہ حالات کی شرعی لحاظ سے مناسب تعین اور منسوخ شدہ احکام سے استفادہ ہے۔

۲- **عدل کا قیام:** اسلامی معاشرہ کی بنیاد عدل واحسان کے قیام وبقاء پر ہوگی اور کسی بھی قانون کو بنانے میں عدل واحسان کا لحاظ رکھنا ناگزیر ہوگا

۳- **حکومت واقتدار-** یعنی حکومت کی اعلیٰ ترین طاقت تو ذات الٰہی ہی ہوگی لیکن حکومت کی کوئی متعین شکل نہ ہوگی بلکہ مجموعی طور پر الٰہی حکمتوں کا انعکاس پیش نظر رہے گا جو مجموعی طور پر یہ ہیں:

۱- شورائی طرز کا نظام

۲- ہر چیز کے امانت ہونے کا تصور

۲- اسلامی ملک کے تمام شہریوں کو بلاتخصیص یکساں حقوق اور مواقع حاصل ہوں گے

۲- غیر مسلموں سے تعلقات کی اصل بنیاد صلح اور امن پر مبنی ہوگی ان سے جنگ کی بنیاد ان کے مذہب کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ ان کے ظلم وزیادتی اور بغاوت وشورش کی وجہ سے ہوگی۔

یہ وہ نکات ہیں جو اسلامی حکومت میں نظریائی اور بنیادوں پالیسوں کی حیثیت سے، اختیار کئے جائیں گے۔ضروری ہے کہ ان نکات کی تھوڑی سی تفصیل بیان کی جائے۔

الف : نسخ

احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت کے سلسلہ میں جس اہم ترین علت کو مولانا نے اپنا متدل بنایا ہے وہ شریعت کی ایک اہم اصطلاح ''نسخ'' ہے نسخ کے سلسلہ میں مولانا کا یہ ارشاد ہے کہ نسخ نام کی کوئی چیز اس معنیٰ میں اسلام میں پائی ہی نہیں جاتی کہ شریعت کا کوئی سابق قانون اصلاً ختم کردیا گیا ہو بلکہ اس سے مراد عام، مطلق اور ظاہر وغیرہ کی دلالت اٹھا دیتا ہے۔اس سلسلہ میں کبھی عام میں تخصیص اور مطلق میں تقید کی جاتی ہے یا مطلق کو مقید پر محمول کرکے اس کی تفسیر

وتوضیح کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ استثناء شرط اور صفت کو بھی نسخ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے ذریعہ بھی ظاہر کی دلالت اٹھا جاتی ہے۔

گویا اصل نسخ احکام شریعت میں نہیں ہوتا بلکہ ان حالات و زمانہ کے اختلاف کی بنیاد پر فتوے تبدیل ہوتے ہیں جن میں وہ قانون یا فتویٰ موثر نہیں رہ جاتا چنانچہ علامہ آمدی نسخ شرعی کی بحث میں لکھتے ہیں:

اذا عرف جواز اختلاف المصلحته باختلاف الازمان فلا یمتنع آن یأمر الله تعالیٰ المکلف بفعل فی ما لعلمهٖ بمصلحة فیه کمایفعل الطبیب بالمریض حت یأمره باستعمال دواء فی بعض الازمنة ونهاه عنه فی زمن آخر بسب اختلاف مصلحته عند اختلاف مزاجه۔ ۳۵؎

یعنی جب زمانہ کے اختلاف سے مصالح کے اختلاف سے کا جواز معلوم ہو گیا تو یہ بات ممتنع نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اس کی مصلحت کے مطابق کسی زمانہ میں کوئی حکم دے اور جب مصلحت بدل جائے تو اس سے منع فرمادے جس طرح طبیب کسی زمانہ میں ایک دوا کا حکم دیتا ہے پھر جب اختلاف مزاج واقع ہوتا ہے تو مصلحت مزاج کے مطابق دوا بدل دیتا ہے اور پہلی دوا کے استعمال پر پابندی عاید کر دیتا ہے۔

لیکن پہلی دوا کے استعمال پر پابندی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوا کلیتہً مردود ہو گئی بلکہ اس کا استعمال دوبارہ ازسرنو پھر کرایا جائے گا جب اس طرح کی مصلحت دوبارہ پیدا ہو جائے گی چنانچہ معروف اسلامی اسکالر علامہ رشید رضا مصری نے مسئلہ نسخ میں جمہور کے رائے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

قالو فی توجیه أنه لامعنیٰ نسخ الا یة فی ذاتها ولاحاجة الیه وانما لاحکام تختلف باختلاف الزمان والمکان والاحوال فاذا شرع حکم فی وقت لشدة الحاجة

الیہ ثم زالت الحاجة فی وقت آخر فمن الحکمة أن ینسخ الحکم ویبدل بمایوافق الوقت الآخر فیکون خیرامن الاول او مثلہ فی فائدتہ من حیث قیام المصلحة۔ ۳۶

یعنی جمہور مفسرین نے نسخ کی توجیہہ میں کہا ہے کہ فی نفسہ نسخ آیت کے کوئی معنی اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ احکام زمانہ ومکان اور حالات کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں، جب کوئی حکم ایک وقت میں شدید حاجت کی بناپر اور وہ حاجت دوسرے وقت میں باقی نہ رہی تو حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حکم منسوخ ہوجائے اور اس کی جگہ دوسرا حکم دوسرے وقت کے مناسب آجائے، یہ دوسرا حکم فائدہ کے لحاظ سے پہلے سے بہتر یا اس جیسا ہوگا۔ کیونکہ اب اسی کے ذریعہ مصلحت کا قیام ہوگا۔

اس لئے مولانا کا بھی اس باب میں یہی فیصلہ ہے کہ:

نسخ کی مذکورہ توجیہہ وتفسیر کے بعد آخری شریعت کے جن احکام میں حالات وزمانہ کی رعایت ناگزیر ہوگی ان پر مروجہ نسخ کا اطلاق درست نہ ہوگا کیونکہ روح اور مقصد کے ساتھ اصل حکم ہمیشہ برقرار رہے گا اس میں تبدیلی کبھی نہ ہوگی۔

تبدیلی صرف شکل وصورت میں ہوتی رہے گی جس کے لئے نسخ کے بجائے ہماری زبان میں موقع ومحل کی تعین کا لفظ زیادہ موزوں ہے اور اس کے لئے احکام منصوصہ وغیر منصوصہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

جیسا کہ فقہ میں ہے۔

مامن حکم شرعی الا وھو قابل للنسح خلافاًللمعتزلہ ۳۷

ہر شرعی حکم نسخ کو قبول کرنے والا ہے، معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے۔

ب:- عدل کا قیام

دوسری چیز جس پر اسلامی معاشرہ ومعاشرت کی صورت گری کی جائے گی وہ عدل وانصاف

کا قیام ہے اس میں کسی عربی، عجمی، مسلمان اور غیر مسلم اور کالے اور گورے اور مرد یا عورت کی تمیز کے بغیر مکمل عدل اور ہر حالت میں عدل ہی اس نظام تمدن و حکومت کی بنیاد ہوگی۔ اور اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت ہے۔

ان لله يأمر بالعدل والا حسان۔ [۳۸]

بلاشبہ اللہ تم کو عدل واحسان کا حکم دیتا ہے۔

دوسری آیت ہے:-

ولايجرمنكم شنان قوم الاتعدلوا اعدلوا هواقرب للتقوىٰ۔ [۳۹]

تمہیں کسی قوم کی دشمنی عدل وانصاف سے غافل نہ کردے، عدل کرو کیونکہ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

علامہ ابن قیم شریعت میں عدل کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان مقصوده اقامة العدل بين عباده وقيام الناس بالقسط فاى طريق استخرج بها العدل والقسط فهى من الدين ليست مخالفه له۔ [۴۰]

شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل وانصاف کا قیام ہے جس طریقہ کے ذریعہ عدل وانصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ ان کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

شریعت کا مدار حکمتوں اور دنیوی واخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے۔ وہ مجسمہ عدل ورحمت اور کل حکمت ومصلحت ہے جو مسئلہ بھی عدل سے جور کی طرف رحمت سے زحمت کی طرف مصلحت سے مفسدہ کی طرف اور حکمت سے عبث کی طرف خروج کریگا وہ شریعت کا مسئلہ نہ ہوگا اگرچہ تاویل کے ذریعہ شریعت میں داخل کرلیا جائے۔ [۴۱]

یہ عدل واحسان دراصل اسلامی معاشرہ کی روح ہے۔ اور اس کا اطلاق ہر طرح کے معاملات

پر ہوگا اس میں معیشت، معاشرت، حریت و آزادی، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات، بنی نوع انسان کی بھلائی اور خیر خواہی غرض ہر وہ چیز شامل ہے جو انسانوں کے فلاح و بہبود سے متعلق ہوں اس میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کسی مخصوص طریق کار کا ثبوت رسول اللہ سے پایا ہی جاتا ہو یا اس کے مطابق وحی نازل ہوئی ہو کیونکہ حالات و زمانہ کا اختلاف کسی خاص واقعہ سے مستلزم نہیں ہوتا بلکہ واقعات میں اصل روح یعنی عدل و قسط کی شمولیت پائی جاتی ہو چنانچہ علامہ ابن قیم اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فاذا ظهرت امارات الحق و ادلته بای طریق فذالك من الشرع و الدین وفیه رضاه و أمره۔ ۴۲

جب حق کی علامتیں اور دلیلیں ظاہر ہوں تو جس طریقے سے بھی ہوں تو وہ شریعت اور دین ہوگا اور اس میں اللہ کی رضا اور حکم ہوگا۔

ج- حکومت اسلامیہ کا قیام

حکومت اسلامیہ کا قیام تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کیونکہ اس کے بغیر اسلام کے فقہی احکام کو کسی بھی طرح روبعمل نہیں لایا جاسکتا۔ اس باب میں مولانا کے خاص نکتہائے نظر یہ ہیں:

۱- قرآن مجید نے حکومت کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی ہے بلکہ حیثیت مقصد اور بنیادی اصولوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے جو یہ ہیں:

۱- اقتدار اعلیٰ اللہ کا ہوگا۔ جیسا کہ فرمایا:

لـه الـملك لااله الاهو ۔۴۳ اُسی کی بادشاہت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں **وهو الذی فی السماء اله وفی الارض اله۔** ۴۴ اللہ ہی ہے جو آسمانوں میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی۔

۲- شورائیت:- حکومت کی شکل اگرچہ متعین نہیں ہے مگر اس کا خدوخال شورائی طرز کا ہوگا یعنی منصوص احکام میں بے چوں و چرا اطاعت الٰہی اور غیر منصوص احکام میں شوریٰ کے فیصلہ کو مانا جائے

گا غیر منصوص احکام میں آخری اتھارٹی صاحب امر کو حاصل ہوگی جو اس بات کی کوشش کرے گا کہ عام اتفاق رائے سے فیصلہ کیا جائے اس کی دلیل یہ آیات ہیں۔

وامرھم شوریٰ بینھم۔ [۴۵]

اور ان کے معاملات باہمی مشورت سے طے ہوتے ہیں۔

وشاورھم فی الامر۔ [۴۶]

اور معاملات میں اُن سے مشورہ کر لیا کرو۔

۳۔ **تصور امانت:۔** کائنات کی ہر شئے ایک امانت ہے۔ حکومت ایک بڑی امانت ہے جو ہر امانت کی نگرانی پر مامور ہے: چنانچہ فرمایا۔

ان اللہ یأمرکم ان تودو الامانات الیٰ اھلھا واذا حکتم بین الناس ان تحکموا بالعدل [۴۷]

بے شک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اس کے اہل تک پہونچادو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

۴۔ **یکساں حقوق یکساں مواقع:۔** اسلامی مملکت کے تمام شہریوں کے حقوق مساوی ہوں گے ذات پات، رنگ نسل، زبان، وطن مذہب وملت کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

یاایھاالناس اناخلقنکم من ذکر وانثیٰ وجعلنٰکم شعوبا وقبایل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ [۴۸]

اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف برادریاں اور قبایل اس لئے بنائے ہیں تا کہ آپس میں پہچان ہو تم میں زیادہ باعزت وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلق کلھم عیال اللہ فأحبھم الیٰ اللہ انفعھم لعبادہ۔

تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ تو اللہ کو زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی عیال کو زیادہ نفع پہونچانے والا ہے۔

د۔ غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت

اسلامی حکومت کے قیام کے بعد ایک بہت بڑا مسئلہ غیر مسلموں سے تعلقات کی نوعیت کا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کا سب سے اہم اصول صلح اور امن ہے چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۴۹

اگر وہ تم سے قتال کے در پے ہوں تو تم بھی ان سے قتال کرو۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا والصلح خیر۔ اور صلح بھلی چیز ہے۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

اموالھم کاموالنا و دماء ھم کدماء نا ۔یعنی ان کے (غیر مسلموں کے) مال ہمارے مال کی طرح ہیں اور ان کا خون ہمارے خون کی طرح ہے۔

غرضیکہ الٰہی شریعت میں غیر مسلموں سے تعلق کی اصل بنیاد صلح اور امن کی ہوگی نہ کہ مجادلہ اور پیکار کی اور یہی امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام احمدؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا مسلک ہے چنانچہ فرمایا:-

واما من لم یکن من اھل الممانعتہ والمقاتلۃ فلا یقتل عند جمھور العلماء۵۳

الزیلعی نصب الرایہ ج / کتاب السیر۔۵۰

جو منع کرنے والے اور جنگ کرنے والے نہ ہوں انہیں جمہور علماء کے نزدیک نہ قتل کیا جائے۔

اس بنیاد پر مولانا کے نزدیک مرتد کے قتل کی وجہ دراصل تبدیلی مذہب نہیں ہے کیونکہ یہ

معاملہ بندے اور اللہ تعالیٰ کا ہے بلکہ اس کے قتل کیے جانے کی بنیادی وجہ بغاوت اور محاربہ ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

بلاشبہ شریعت میں تبدیلی مذہب کفر اور بڑا گناہ ہے لیکن یہ معاملہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے۔حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے حکومت صرف بغاوت کی بنا پر سزا دے سکتی ہے جس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جس کی طرف سے بھی بغاوت پائی جائے گی اس کے خلاف کاروائی ضرور ہوگی۔چنانچہ امام سرخسیؒ اپنی کتاب المبسوط میں ارشاد فرماتے ہیں:

ان القتل باعتبار المحاربه (مرتد کا قتل) جنگجوئی کی وجہ سے ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

لان القتل لیس بجزاء اعلیٰ الردہ۔۱۵۱

کیونکہ قتل مرتد ہونے کی بنا پر نہیں ہے۔

بہر حال مولانا تقی امینی صاحبؒ کی فقہی بصیرت کا اندازہ ان کی کتاب ''احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت'' سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے،اس کتاب میں مولانا نے مسئلہ کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔اصولوں کی بحث اوپر گذر چکی ہے مسائل واحکام کے باب میں خاص طور سے حدود سے مثالیں پیش کی ہیں جس میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں چوری ثابت ہونے کے باوجود چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم نہیں دیا بلکہ مختلف حالات کی روشنی میں کبھی چوری کا مال دگنا واپس کرایا اور کبھی قحط سالی کے زمانہ میں کھانے پینے کی چیزوں پر ہاتھ نہیں کاٹے۔

چنانچہ جب حاطب بن ابی بلتعہ کے کچھ غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرائی تو پہلے تو آپؓ نے ان کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور پھر یہ کہہ کر روک دیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ غلاموں کے ساتھ اتنا برا سلوک کرتے ہو کہ اگر وہ مجبور ہو کر حرام بھی کھالیں تو یہ ان کے لئے جائز ہوگا۔حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں:

أما والله لولا انی أعلم انكم تستعملونهم وتجيعونهم حتی ان أحدهم لوأكل ماحرم الله عليه لقطعت ايديهم۔[۵۲]

سنو بخدا اگر مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم لوگ غلاموں سے خوب کام لیتے ہو پھر ان کو بھوکا بھی رکھتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی مجبور ہو کر حرام چیز کھالے تو وہ اس کے لئے حلال ہو جائے۔ (اگر مجھے یہ سب نہ معلوم ہوتا) تو میں یقیناً ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

اس ضمن میں مولانا نے عہد رسالت وخلافت اور قرآن وحدیث کی جزئیات، نیز ائمہ مجتہدین کے فتاویٰ سے دلایل پیش کر کے اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت ناگزیر ہے محض آنکھیں بند کر کے اور احوال زمانہ سے بے نیاز ہو کر ہم دین کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔

مگر رعایت کے حدود کیا ہوں گے اس میں احتیاط کی شدت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اجتہاد، اجماع، اور اسناد حدیث کے ساتھ ساتھ درایت حدیث کی طرف توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے جس کی تفصیلی وضاحت کتاب میں موجود ہے۔

۴- فقہ کی اجتماعی مسائل

جیسا کہ ہم مولانا کی فقہی بصیرت کے ضمن میں واضح کر چکے ہیں کہ حل طلب مسائل میں مولانا، اجماع، اجتہاد، شورائی نظام، اور اسلام کے بنیادی اصولوں نسخ، عدل واحسان اور مقتضیات زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے جدید فقہ کی عمارت تعمیر کرنے کے قابل رہے ہیں۔ یہ ہماری گفتگو کا آخری پڑاؤ ہے اس میں ہم فقہ کے کچھ ایسے اجتماعی مسائل کی بات کریں گے جو آج کے زمانہ کا مسئلہ ہیں مولانا کا ان مسائل کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے۔ اور وہ ان مسائل کو کسی طرح حل کرتے ہیں آیئے اس پر غور فرمائیں:-

مولانا فرماتے ہیں:

''حالات کا جائزہ لینے کے بعد تین قسم کے اجتماعی مسائل ہوں گے جن میں غور وفکر کے بعد فقہ کو ضروریات زندگی سے ہم آہنگ بنانا پڑے گا وہ یہ ہیں:-

۱- حکم اصولی اور کلی شکل میں موجود ہے لیکن حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس کے موقع ومحل میں تبدیلی لازمی بن گئی ہے۔

۲- حکم موجود ہے لیکن اس پر عمل درآمد سے قومی وملی نقصان کا یقین ہے یا حالات ومصلحت بدل جانے کی وجہ سے اب اس کا اصل مقصد فوت ہورہا ہے۔

۳- زمانے کی کروٹوں اور ضرورتوں نے نئے حالات ومسائل پیدا کردیئے ہیں جن کا تذکرہ ''فقہ'' میں نہیں ہے، اصولی اور عمومی رنگ ہدایت الٰہی ان سب کو شامل ہے جیسا کہ فقہ کی درج ذیل تصریحات میں ان مسائل کی طرف اشارہ ہے

ان اللہ انزل من الاحکام مایصلح لکل زمان ومکان فمنھا مانص علیہ نصاً صریحاً ومنھا قواعد عامۃ یمکن تطبیقھا حسب ظروف الناس واحوالھم وبیئاتھم۔

اللہ تعالیٰ نے (اصولی رنگ میں) وہ احکام نازل فرمائے جن میں ہر زبان ومکان کے لئے صلاحیت موجود ہے بعض احکام کی صراحت ہے اور بعض عمومی قواعد کی صورت میں ہیں کہ ان کے ذریعہ لوگوں کے ظروف ان کے احوال نیز موقع ومحل کی مطابق حاصل کی جاسکتی ہے۔

ایک اور موقع پر ہے:

فلابُدّ من حدوث وقائع لاتکون مخصوصاً علی حکمھا ولا یوجد للاولین فیھا اجتھاد وعند ذلک فاما ان یترك الناس فیھا مع اھوائھا اوینظر فیھا بغیر اجتھاد شرعی وھو ایضا اتباع الھویٰ وذلك فی کلہ فساد۔

یہ ضروری بات ہے کہ ایسی نئی نئی صورتیں پیش آئیں جن کا صریح حکم نہ موجود ہو اور نہ پہلے

لوگوں نے ان میں اجتہاد کیا ہوا ایسی حالت میں اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ من مانی کار روائی کریں یا اجتہاد شرعی کے بجائے محض اٹکل کے تیر چلائیں تو یہ فساد اور ہلاکت و بربادی ہے۔

مذکورہ تینوں قسموں کا بیشتر تعلق دراصل فقہ کے ان احکام سے ہے جن کی صرف روح اور معنی مقصود ہیں، صورت اور قالب مقصود نہیں ہیں روح اور معنی برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی حالت کی تبدیلی اور تمدنی ترقی کے ساتھ صورت اور قالب بدلتے رہتے ہیں اس بناء پر ہر دور اور ہر عہد میں حالات مناسبت سے ایسے احکام میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔۵۲

موجودہ عہد ہر لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے اس کے مسائل بہت الجھے ہوئے اور پیچیدہ قسم کے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی متوازن صورت نکالے بغیر اسلامی نظام چل نہیں سکتا۔ اس پر ہر حال میں غور فکر کی ضرورت ہے۔

موجودہ عہد کے مسائل اور ان کے الجھاؤ کس نوعیت کے ہیں آیئے اس پر غور کریں۔ یہ نظام بڑی حد تک ''سود'' پر قائم ہے جس کو یک بیک ختم کر دینا یقیناً دشواری اور بظاہر مالی خسارہ کا باعث ہے۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اندرون ملک جو سودی کاروبار چل رہے ہیں پہلے ان پر دیانتداری کے ساتھ قابو حاصل کیا جائے، پھر بین الاقوامی کاروباری معاملات پر غور کیا جائے اور رفتہ رفتہ اس کی متوازن صورت نکالی جائے اس پورے نظام میں اگر کوئی پہلو ایسا بھی ہے کہ جس پر ''سود'' کا اطاق حقیقۃً نہیں ہوتا تو اس کو ''سود'' سے خارج کر دینے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے بشرطیکہ اس کی تائید نصوص شرعیہ سے ہوتی ہو۔ ''کمرشل انٹرسٹ'' اور انشورنس'' وغیرہ کے مسایل میں بھی ہوتا ہے الٰہی کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے فوائد و نقصان کے پیش نظر کس حد تک انہیں ''قبول'' اور کس حد تک انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

دراصل ''سود'' کے اثرات صالح معاشرہ میں نہایت دور رس ہیں، اس لئے بہت سوچ سمجھ کر بتدریج قدم اٹھانے کی ضرورت ہوگی، نیز اس قسم کے تمام مسائل میں اہل فن کی رائے و مشورہ

کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ وہی اصل حقیقت کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک ان مسائل کے حل کے لئے بنیادی حیثیت سے تین باتوں کی رعایت ضروری ہے:

۱- **اصول تدریج**

۲- **الاقدم فالاقدم**

۳- نمائندہ الٰہی حکومت کے فرائض واختیارات۔ اس طریق کار کے اختیار کرنے سے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے، اور بہت سوں کے لئے راہیں پیدا ہو جائیں گی، اور بہت سے ایسے نکلیں گے جن کے حل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔

فقہاء کرام نے نہایت گراں قدر سرمایہ جمع کر دیا ہے جن سے کام لئے بغیر اس راہ کی کوئی جد وجہد نہ کامیابی کی منزل تک پہونچ سکتی ہے اور نہ ہدایت الٰہی سے مطابقت کی کوئی ضمانت حاصل ہوسکتی ہے۔[۵۴]

آیئے ان اصولوں کی روشنی میں چند متعین مسائل پر غور کریں اور دیکھیں کہ مولانا نے وقت کے اہم ضروری اور اہم مسائل کو اپنے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں کس طرح حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱- **مسئلہ ملکیت آراضی**

ذرائع پیداوار کی صحیح تنظیم وتقسیم ہی پر کسی مملکت کی خوش حالی وفارغ البالی موقوف ہے اور اس میں آراضی کے مسئلہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

اس لئے ہدایت الٰہی نے حسب دستور اس مسئلہ میں بھی مقصد پر زیادہ زور دیا ہے کہ مخلوق کے لئے بسہولت خورد ونوش کا سامان مہیا ہو اور بلا تخصیص مذہب وملت حسب ضرورت وصلاحیت اس کی تقسیم کا بندوبست ہوتا رہے۔

نیز مفاد عامہ کے پیش نظر اس نے تنظیم تقسیم کی کوئی خاص صورت متعین نہیں کی بلکہ خلافت کو اختیار دیا ہے کہ وہ حسب حاجت و مصلحت تنظیم و تقسیم کا اس طرح نظام قائم کرے کے عدل وانصاف کے ساتھ خلق اللہ کو رزق حلال پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوشی اور اللہ کے روبرو سرخروئی حاصل کر سکے۔

اس اہم مقصد کے حصول کے لئے خلافت پر یہ بندش نہیں کہ وہ ذرائع پیداوار کو افراد کے سپرد کرے یا جماعتوں کے، البتہ یہ ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار جس کے بھی سپرد کئے جائیں اس کی حیثیت محض امین کی ہو اور اسی وقت تک ان کو اس کے استعمال وانتفاع کا حق حاصل ہو جب تک وہ حصول مقصد میں خلافت کا ہاتھ بٹاتے رہیں اور ایسی فضاء پیدا کرنے میں مددگار بنیں جو عام مخلوق کی خوش حالی وترقی کی ضامن ہو۔

یہاں اس امر کی وضاحت غیر ضروری ہے کہ خلافت پوری مملکت کی ذمہ دار اور خدا کی حاکمیت وجلال جبروت کے آگے جواب دہ ہوتی ہے۔ یہ ہے ملکیت آراضی کے سلسلہ میں اسلام کا واضح تصور۔ مگر کیا یہ صورتحال آنحضرتؐ کے زمانہ میں بالکل واضح تھی۔ نہیں بلکہ یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہو کر خلافت فاروقی میں سامنے آیا جب فتوحات کی کثرت ہوئی بالخصوص عراق اور شام جیسے ممالک فتح ہو کر مملکت اسلامیہ کے قلمرو میں شامل ہوئے۔ اس وقت اراضی کی تنظیم و تقسیم کی بابت صحابہ کرامؓ میں مشورہ ہوا۔ اس صورتحال کی پوری تفصیل مولانا کے قلم گوہر رقم سے ملاحظہ ہو۔

مجلس سوریٰ میں دو قسم کی رائے رکھنے والے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت بلالؓ وغیرہ کی رائے یہ تھی کہ مفتوحہ زمین فوجیوں میں تقسیم کردی جائے۔ اور حضرت علیؓ وحضرت عثمانؓ وحضرت معاذؓ بن جبل وغیرہ کی رائے تھی کہ خلافت کے زیر اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے فوجیوں میں نہ تقسیم کی جائے۔

چونکہ اس بارہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل مذکورہ مقصد اور مفاد عامہ کے پیش نظر

مختلف تھا۔ اس بناء پر دونوں فریق اپنی رائے کی تائید میں آپ کے طرز عمل سے استدلال کرتے تھے۔ ایک فریق کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرز عمل تھا، جو آپ نے بنونضیر و بنوقریظہ کی کل زمین اور خیبر کے کچھ حصے کے بارے میں اختیار فرمایا تھا، کہ یہ زمین آپ نے فوجیوں میں تقسیم کردی تھی اور دوسرے فریق کے سامنے وادی القریٰ اور مکہ کی کل زمین اور خیبر کی بقیہ زمین تھی، کہ آپ نے مفاد عامہ کے پیش نظر اصل باشندوں کے پاس رہنے دی تھی فوجیوں میں نہ تقسیم کی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کی بناء پر اپنی جگہ مضبوط اور دلائل میں قوی تھا اس لئے مجلس میں بڑی گرما گرم بحث ہونے کے باوجود کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا اور حضرت عمرؓ کو دوبارہ مجلس شوریٰ طلب کرنی پڑی جس میں آنے والے حالات کی نزاکت ملحوظ رکھتے ہوئے مجلس شوریٰ کے ممبروں کے علاوہ انصار کے دس معزز آدمیوں کو بھی خصوصی دعوت پر شریک کیا گیا تھا۔

اس مجلس میں حضرت عمر فاروقؓ نے مجلس کے سامنے چند بنیادی ''نکات'' پیش کئے اور اپنی مدلل تقریر کے ذریعہ سب کو ان ''نکات'' میں غور وفکر کی دعوت دی جس کا خلاصہ یہ ہے۔ آپ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا۔

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ جس بار امانت کو آپ ہی لوگوں نے میرے سر پر رکھا ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں، اس وقت مجلس میں میری پوزیشن خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں کے ہر فرد جیسی ہے، ہر فرد کو اپنی رائے پیش کرنے کا بھی پورا اختیار ہے، ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے کہ اس معاملہ میں مشورہ ہو چکا ہے مجلس کے کچھ لوگوں نے میری رائے کی مخالفت کی اور کچھ نے میری موافقت کی ہے۔ میں نے ہرگز نہیں چاہا تھا کہ آپ لوگ میری مرضی کی اتباع کریں اور حق بات چھوڑ دیں بلکہ میں صرف حق بات کی طرف ہی آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس طرح میرے پاس اللہ کی کتاب ہے ویسے ہی آپ لوگوں کے پاس بھی ہے جو ناطق بالحق ہے۔ اس کو سامنے رکھ کر مشورہ دیجئے، جو کچھ اس میں موجود ہے اس پر عمل کرنا ہم

سب کا فرض ہے۔

اس موقعہ پر حضرت عمرؓ نے سورۃ الحشر میں مذکور آیات ـ فے (ماأفاء الله علىٰ رسوله من اهل القرىٰ.....انك رئوف رحيم)۵۵؎ سے استدلال کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی اس کا ترجمہ یہ ہے۔

کیا آپ حضرات نے ان لوگوں کی باتیں نہیں سنیں جو مجھے اس معاملہ میں شریک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید ان کا یہ خیال ہو کہ میں ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں، حالانکہ کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا میرے نزدیک صریح ظلم ہے۔ معاذ اللہ! خدا شاہد ہے کہ میں نے کبھی کسی معاملہ میں ان پر ظلم کیا ہو۔ یا اب ظلم کرنے کے ارادہ ہو۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ عراق و شام فتح ہونے کے بعد اور کون سی زمین رہ گئی ہے جس کی آمدنی سے خلافت کا انتظام سنبھالا جا سکے گا، یہ تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے کسریٰ کے اموال، زمین جائداد اور جفاکش کام کرنے والوں پر ہمیں غلبہ عطا فرمایا ہے۔

آپ لوگ خود اس کے شاہد ہیں کہ اموال منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا، خمس (مال غنیمت کا پانچواں حصہ) بھی مناسب محل پر صرف کر دیا۔ اب صرف زمین (جائداد غیر منقولہ) باقی بچی ہے اس کے متعلق خیال ہے کہ اس کو اس کے آتش پرست مالکوں ہی کے پاس رہنے دیا جائے۔ اور زمین پر ٹیکس (خراج) اور مالکوں پر ان کے جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ (جزیہ) مقرر کر دیا جائے، تا کہ یہ سب آمدنی اجتماعی مفاد کے کاموں میں خرچ کی جائے اور اس کے ذریعہ فوجیوں کی تنخواہوں اور موجودہ اور بعد کے آنے والے لوگوں کا بندوبست کیا جائے۔

آپ ہی بتائیے کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ کیا جزیرہ کوفہ، بصرہ، عراق، شام، اور مصر وغیرہ کے بڑے شہروں میں ان کی حفاظت کے لئے فوجی چھاؤنیوں کی ضرورت نہ ہوگی۔ اگر زمین تقسیم کر دی جائے تو فوجیوں کی تنخواہیں، بھتے اور دوسروں لوگوں کے وظیفوں کی رقم کہاں سے آئے گی؟ فاروق اعظمؓ کی اس بصیرت افروز تقریر سے

تمام ممبر متاثر ہوئے اور انہوں نے ان الفاظ میں تائید کی۔

فقالوا جميعاً الرائی رأئيك فنعم ماقلت و مارأيت۔

سب نے کہا کہ بس آپ ہی کی رائے اس معاملہ میں زیادہ درست ہے۔

حضرت عمرؓ کی تقریر اور شوریٰ کے فیصلہ میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ خلق اللہ کا مفاد اور احساس ذمہ داری ہے۔ دراصل رب العالمین کے سامنے جواب دہی کا حقیقی تصور خلافت کو گوشۂ تنہائی میں بھی حق تلفی سے باز رکھتا اور ذرائع پیداوار کو اس طرح استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ نہ کوئی چیز بیکار رہنے پائے اور نہ ضائع ہو۔ ۵٦

یہی صورتحال فتح مصر کے بعد مصر کی اراضی اور دوسری خالصہ اور موقوفہ اراضی کے تعلق سے اختیار کی گئیں اور خلیفۃ المسلمین کے لئے یہ جائز رکھا گیا کہ وہ بحیثیت خلیفہ آراضی کا مالک و مختار رہے اور بحیثیت امین اس میں تصرف کرسکتا ہے اس کی توضیح ذیل کے اقوال سے ہوسکتی ہے۔

امام اعظم حضرت ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

ان نواحی دارالاسلام تحت يدامام المسليمن۔ ۵۷

دار اسلام کے اطراف خلیفہ المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں۔

امام مالکؒ کا ارشاد ہے:

يصير الارض للسلطان۔ ۵۸

زمین حاکم (خلافت) کی ہوتی ہیں۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں:

ان حكم الارضی للامام۔

زمین کا معاملہ خلیفہ (خلافت) کے سپرد ہے خلافت کے اس اختیار میں نہ حقوق ملکیت کا

''گورکھ دھندا'' حائل ہوتا ہے اور نہ محض جذباتی چیزیں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔

چونکہ خلافت کے ہر تصرف وفیصلہ میں اشخاص کے ذاتی مفاد کا لحاظ ضروری ہے۔اس لئے ایسے تمام مواقع میں وہ ذاتی مفاد کا پورا لحاظ رکھتی ہے۔لیکن ذاتی اور جماعتی مفادات کے ٹکراؤ کی صورت میں وہ جماعتی مفادات کو ترجیح دیتی ہے۔

یہ واضح رہے کہ خلافت کے مذکورۂ بالا وسیع اختیارات اس کے ذمہ داریوں کی بناء پر اس کو حاصل ہیں، دوسری حکومتیں اسی وقت ان سے استدلال کرسکتی ہیں جب وہ بھی خلافت جیسی ذمہ داریاں قبول کریں، ہر حکومت اس کے مجاز نہیں ہے۔

۲- شیئرز کی خریداری اور اسلام:

موجودہ دور کے کے مالیاتی نظام میں شیئرز کی خرید وفروخت ایک اہم مسئلہ ہے۔مگر اس کی تہہ اور گہرائی میں اتر کر دیکھیں تو یہ پورا سسٹم ہی سٹہ بازی اور اندازوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے اور اس نظام سے صرف وہی لوگ نفع کما پاتے ہیں جو اس کے ڈائریکٹرز یا کمپنی کے مالکان اور دوسرے چیدہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں کمپنی مالکان کی ذہنیت اور کمپنی کے اتار چڑھاؤ کا علم ہوتا ہے۔حالانکہ کمپنیوں کی قانونی اور سرکاری اندراجات دیکھئے تو آپ کو کہیں سے جھول نظر نہ آئے گا مثلاً رجسٹرار کے پاس دستاویزات جمع کرنا، کام شروع کرنے کا سرٹیفکٹ حاصل کرنا اور کمپنی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی گاہک کو جانکاری دینا وغیرہ مگر جب اس کی تفصیل میں جائیے تو گھپلے ہی گھپلے نظر آتے ہیں مولانا کی نظر اس جدید مالی نظام کے فوائد ونقصانات دونوں پر ہے آیئے دیکھیں مولانا اس صورتحال کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں:

مولانا فرماتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ موجودہ طریق پیداوار میں مشترکہ کہ سرمایہ کی کمپنیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان کے ذریعہ۔وسیع پیمانہ پر کاروبار چلانے کے لئے زیادہ سرمایہ جمع ہوتا ہے اور صنعت

وحرفت نیز تجارت کوفروغ دینے میں بڑی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔

لیکن فوائد کے ساتھ کمپنی کے موجودہ نظام میں چند خرابیاں بھی بیان کی جاتی ہیں جن کے وضاحت ضروری ہے مثلاً:

۱- کمپنیوں کا یہ نظام اس قدر واسطہ درواسطہ اور پچیدہ ہے کہ اس کو اجتماعی شکل دینا نہایت مشکل کام ہے۔

۲- خرید وفروخت کے ذریعہ حصوں کا ہر وقت منتقل ہوتے رہنا اس کاروبار کا خاص گُر ہے۔ لیکن اس منتقلی میں دھوکہ دہی، ناانصافی، اجتماعی مفاد کی قربانی اور ناجائز استحصال وغیرہ قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں۔

۱- ڈائریکٹر ومنیجر وغیرہ چونکہ کمپنی کی حالت خراب دیکھتے ہیں تو اپنے حصوں کو فروخت کرنا شروع کردیتے ہیں، اسی طرح جب اس کی حالت اچھی ہوتی ہے تو اپنے ایجنٹوں اور رشتہ داروں کے ذریعہ زیادہ حصے خرید لیتے ہیں۔

۲- ڈائریکٹر وجنرل منیجر وغیرہ کے اختیارات اب اگرچہ پہلے کے مقابلہ میں محدود ہو گئے ہیں لیکن کاروبار کا یہ سرمایہ دارانہ نظام ہی کچھ اس قدر پیچیدہ ہے کہ مذکورہ قسم کی برائیوں سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔

۳- خرید وفروخت کے وقت ہر شخص صرف اپنے مفاد کو مدنظر رکھتا اور مشترکہ مفاد کو بالکلیہ نظر انداز کردیتا ہے۔

۴- یہ کمپنیاں بڑی حد تک قرض (ادھار) پر چلتی ہیں جس کی بنا پر ہمیشہ سود کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۵- اس نظام میں اجارہ داری بڑھتی ہے اور سرمایہ ایک طبقہ میں محدود رہتا ہے جس سے امارت وغربت میں توازن برقرار رکھنے کی صورت نہیں رہ جاتی۔

۶- دلالوں کا ایک پیشہ ور درمیانی طبقہ بھی آتا ہے جو صرف اپنے کمیشن سے دل چسپی رکھتا ہے،

خواہ بازار کا بھاؤ گھٹے یا بڑھے۔ جس طرح قمار خانہ کے مالک اور گھوڑ دوڑ کے منتظمین کو اصل دل چسپی اپنے کمیشن سے ہوتی ہے ہار جیت سے ان کو کوئی بحث نہیں ہوتی۔ ۵۹

اس کے بعد مولانا نے اپنی مذکورہ باتوں کو اس فن کے ماہرین کے اقوال سے ثابت کیا ہے اس کے لئے وہ درج ذیل حوالے نقل کرتے ہیں:

مور لینڈ صاحب لکھتے ہیں:

''اس قسم کا کاروبار سراسر قمار بازی معلوم ہوتا ہے۔ محض مستقبل کے حالات کے اندازہ پر لوگ کاروبار کرتے ہیں......بس اگر کوئی ناتجربہ کا طلب ورسد کے پورے حالات جانے بغیر یونہی ایسا کاروبار شروع کردے تو یقیناً جلد یہی اس کا دیوانہ نکل جائے گا

پروفیسر ٹاسگ کہتے ہیں:

''موجودہ زمانہ کے کارپوریشن یا انجمن سرمایہ مشترک کے حصے داروں میں مشترکہ اغراض کے لئے اجتماعی مسائل کا احساس بالکلیہ مفقود ہو گیا ہے۔ ہر شخص محض اپنے ہی ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا اور متوقعہ نقصان کی صورت میں اس کاروبار سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ جس طرح کہ چوہا اس ڈوبتے جہاز کو چھوڑ دیتا ہے، جس میں اب تک پناہ لیئے ہوئے تھا۔ یا اگر اس کو اس کاروبار میں آئندہ زیادہ منافع ملنے کی توقع معلوم ہوتی ہے تو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر دوسرے ساتھ والے حصے داروں سے کثیر تعداد میں خرید لیتا ہے، جب کمپنی کے حالات خراب ہوں تو حصے فروخت کردینا اور جب حالات روبہ اصلاح ہوں تو خرید لینا، یہ کاروبار کا خاص گُر ہے۔

جان اے ٹاڈ کہتے ہیں:

''رقم کی فوری ضرورت پر بینک اہل معاملہ کو جو قرض دیتے ہیں اور حصص دتمسکات

بطور ضمانت اپنے پاس رکھتے ہیں ان کی قیمت قرضہ سے زائد ہوتی ہے۔ بنک اس قسم کے کاروبار بہت محدود طریقہ پر کر سکتے ہیں اس لئے دلالوں کا ایک خاص طبقہ اس کو انجام دینے کے لئے رونما ہو گیا۔ اس کو راہن اور دلال کہتے ہیں اور وہ عملاً حصص وتمسکات کو رہن کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔

غرض کمپنی کے موجودہ نظام میں ماہرین معاشیات نے کئی قسم کے نقائص بیان کئے ہیں جن کے بارے میں پروفیسر ٹاسگ نے یہاں تک کہا ہے کہ:

تخمینی قمار بازی کے نقائص جتنے قطعی اور یقینی ہیں اسی طرح وضع آئین وقوانین کے ذریعہ سے ان کو روکنا یا ان کا استیصال کرنا انتہائی مشکل چیز ہے۔[۶۰]

مولانا نے مذکورہ صورتحال کے متعلق جو قباحتیں مثلا اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی طلب ورسد کے مطلوبہ تناسب میں خلل اندازی، ناجائز استحصال ضرر، دھوکہ اور جہالت وغیرہ پائی جاتی ہیں ان کو وضاحتا اور مفصلا بھی بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسٹاک ایکسینج پر خرید وفروخت ناجائز ہے۔ کیوں؟ اس وجوہ وہ مختصراً یوں بیان کرتے ہیں۔

(ا) کمپنی کے ڈائریکٹر ومنیجر حصہ داروں کے امین اور ان کے مفاد کے محافظ ہوتے ہیں لیکن یہ لوگ بھی دھوکہ دے کر حصہ داروں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(ب) کمپنی کے اندرونی حالت سے جن کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے وہ فرضی طور پر خرید کر کے یا احتکار وتخمین کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں جس سے دوسرے حصہ داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(ج) حصص کی منتقلی میں چونکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوتی ہے اس بناء پر حق تلفی دھوکہ دہی اور ناجائز استحصال وغیرہ کو کاروباری حلقوں میں برا نہیں سمجھا جاتا۔

(د) حصص کی انتقال پذیری کی توقع (بالواسطہ) مستقبل کے تخمینی کاروبار کو فروغ دیتی او تمسک

کے صرافوں کو جنم دیتی ہے جن کے اثرات نہایت دوررس اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔

(ر) حصص پر نفع مذکورہ تقسیم بعض صورتوں میں جہالت پیدا کرتی اور بعض میں حق تلفی کا باعث بنتی ہے جیسا کہ ''ترجیحی حصص'' کی بعض شکلوں میں ہوتا ہے۔

(س) بار بار حصص کی منتقلی سے اخلاقی حس کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اجتماعی مفاد مجروح ہوتا ہے۔

(ص) تمسکات کے مالک صرف نفع میں شریک ہوتے ہیں ''سود'' کے مستحق ہوتے ہیں، نقصان سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

(ط) تمسکات کی خرید وفروخت کرنے والے ہر وقت ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اوران کی قمار بازی میں بہت کچھ غیر پیداواری محنت صرف کرتے ہیں جس کو ماہرین معاشیات نے چوری کرنے اور بھیک مانگنے والوں کی محنت سے تشبیہ دی ہے۔

(ع) یہ کاروبار چند چالاک وچالباز قسم کے دلالوں میں محدود ہوگیا ہے جو کمیشن حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی غلط شہرت وجائزہ ناجائز سے دریغ نہیں کرتے۔[۶۱]

ظاہر ہے اسلام میں ہر قیاسی حکم کا مدار علت ہے۔ بس جب مولانا نے اسٹاک ایکسچینج پر حصص کی خرید وفروخت کے عدم جواز کا فتویٰ دیا ہے تو انہوں نے اس کی علت بھی متعین کی ہے۔ ان کے نزدیک شراب اور جوئے کی طرح سٹہ بازی اور حصص کی خرید وفروخت کے ناجائز ہونے کی بھی علت اخلاقی اور روحانی نقصان ہے حالانکہ اس کے فوائد بھی بیان کئے جاتے ہیں لیکن اس کے نقصانات فواید پر بھاری ہیں اگر ان نقصانات کو کسی طرح کم یا ختم کردیا جائے تو ''علت'' کی عدم موجودگی کی شکل میں اسکا جواز بھی نکل آئے گا مثلاً اس کاروبار کی بعض ناجائز پیچیدگیاں یہ ہیں:

۱- کمپنی کے نظام کا واسطہ در واسطہ ہونا

۲- بار بار حصص کی منتقلی

۳- حصص کی تقسیم میں جہالت

۴- تمسکات کا اجراء

۵- دلالوں کا پیشہ ور درمیانی طبقہ

یہ پیچدگیاں مولانا کے بھی پیش نظر ہیں وہ ان کے ختم کرنے کی تدبیر اس طرح بتاتے ہیں:

ان راستوں کے بند کرنے کی تدبیریں یہ ہیں۔

۱- واسطوں کو کم کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ شرکت ومضاربت کی بنیادوں پر مشترکہ کمپنیوں کے لئے قواعد وضوابط مقرر کئے جائیں جس میں کسی ایک مسلک کی پیروی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ہر فقہی مسلک اور اصول وکلیات سے استفادہ کی گنجائش ہے۔ نیز اجتہاد کے ذریعہ قوانین وضع کرنے کی اجازت ہے۔

۲- حصص کی منتقلی کا نظم ختم کیا جائے کہ اس کے بغیر دوسروں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی سے نجات ملنی مشکل ہے۔

یہ منتقلی مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کے کے لوازم میں سے نہیں ہے کہ وہ اس کے بغیر تشکیل ہی نہ پاسکیں یا ان کا چلنا ناممکن ہوجائے بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ کمپنی کے حصہ دار اپنے کو مستقل طور پر کمپنی سے وابستہ کرلیں خواہ انہیں فائدہ ہو یا نقصان جیسا کہ ''شرکت'' میں ہوتا ہے۔

۳- تقسیم کی جہالت دور کی جائے اس طرح کہ بڑے حصوں کو محدود سے محدود تر کر دیا جائے اور مختلف قسم کے حصے بند کر کے زیادہ مقدار میں ایک قسم کے چھوٹے حصے جاری کئے جائیں تاکہ عوام کو زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔

۴- تمسکات کا اجراء بند کردیا جائے کہ اس بغیر ادھار اور سود کا سلسلہ نہ ختم ہوسکے گا اس کے بجائے کاروباری اغراض کے لئے حکومتیں کمپنی کے کاروبار میں شرکت کر کے حصے خرید سکیں حکومت مقررہ قواعد وضوابط کے مطابق اسی قرض کے نفع ونقصان دونوں میں کمی وبیشی کے ساتھ تقسیم کر کے شریک ہوسکتی ہے۔

۵- دلالوں کا پیشہ ور درمیانی طبقہ ختم کیا جائے اگر کاروبار چلانے کے لئے کچھ مشیر کاروں کی ضرورت ہو تو ان کو قانونی و اخلاقی ضابطوں کا زیادہ سے زیادہ پابند بنایا جائے۔

ان اصلاحات کے نافذ کرنے میں ابتداء دشواری ہوگی لیکن رفتہ رفتہ دشواری پر قابو پا کر معاشرتی زندگی کا نقشہ بدلا جاسکتا ہے جیسا کہ ہر اصلاحی و انقلابی تحریک میں ابتداء دشواری ہوتی ہے لیکن بعد میں راہیں ہموار ہو جاتی ہے۔[۶۲]

اس کے بعد مولانا نے پوری تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک اور غیر ترقی یافتہ ممالک دونوں میں حصص کی خرید و فروخت اور مالیاتی تنظیم نیز معاشی مشکلات کے حل کرنے بلکہ خود کفیل ہونے میں اسلام کا کیا کردار ہوسکتا ہے اور زمینی سطح پر ان مسائل کو اسلام کس طرح حل کرتا ہے ظاہر ہے ان مسائل کی جزئی تفصیلات اس مقالہ میں ممکن نہیں ہے اس لئے تفصیل کے طالبوں کو اس کے ادراک کے لئے مولانا کی کتاب ''اسلام اور جدید دور کے مسائل'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

۳- بیمہ کی شرعی حیثیت

جدید دور کا ایک اور بہت بڑا مسئلہ بیمہ (insurance) ہے۔ خطرات مسائل اور مشکلات انسانی زندگی کے لئے لازم و ملزوم ہیں ایسی صورت میں ان مسائل کا اسلام کیا حل پیش کرتا ہے اور جدید مادی نظام نے ان کا جو حل تجویز کیا ہے اس میں کیا خرابیاں پنہاں ہیں؟ مولانا نے اس مسئلہ پر بھی مفصلاً کلام کیا ہے۔ اس لئے آیئے پہلے بیمہ کی حقیقت اور اس کی قسموں کو مولانا کے قلم سے سمجھیں اس کے بعد اس کی شرعی صورتحال پر گفتگو ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں:

''بیمہ (insurance) مستقبل کے امکانی حادثات و ناگہانی خطرات میں مالی کفالت کے لئے بیمہ دار اور کمپنی کے درمیان ایک قسم کا معاہدہ ہے جو پہلے سے مقرر کردہ شرطوں کے مطابق انجام پاتا ہے۔

اس معاہدہ کے مطابق بیمہ دار معینہ رقم یکمشت یا قسط وار کمپنی کو ادا کرتا ہے جس کو پریمیم

''PREAMIUM'' کہتے ہیں۔اور کمپنی اس کے عوض حادثہ ضعیفی یا موت کے وقت ایک مجموعی رقم واپس کرتی ہے جس کو بیمہ شدہ اماونٹ ''INSURED AMOONT'' کہتے ہیں۔

بیمہ کرنے سے پہلے کمپنی حالات کا جائزہ لیتی پھر اس کو قبول کرکے پالیسی دیتی ہے جس کے لینے والے (بیمہ دار) کو پالیسی ہولڈر ''POLICY HOLDER'' کہتے ہیں۔

یہ پالیسی ایک قسم کی دستاویز ہوتی ہے جس میں متعلقہ تفصیلات درج ہوتی ہیں۔مثلاً قسط کی رقم مجموعی رقم جو ادا کرتی ہے، سالانہ ادائیگی اور کمپنی جس قدر رقم واپس کرے گی وغیرہ۔ بیمہ کی بنیادی حیثیت سے دو قسمیں ہیں:

۱- **اموال کا بیمہ**

۲- **زندگی کا بیمہ**

اموال کا بیمہ جنرل انشورنس کمپنیاں کرتی ہیں ان کے تحت درج ذیل قسم کے بیمے کئے جاتے ہیں:

۱- بحری بیمہ

۲- آگ کا بیمہ

۳- حادثاتی بیمہ

۴- شخصی بیمہ یعنی اعضاء انسانی وغیرہ کا بیمہ

۵- جائداد کا بیمہ-از قسم منقولہ وغیرہ منقولہ

اسی طرح بیمہ زندگی میں عام طور سے پہلے ڈاکٹری معاینہ کے ذریعہ صحت وتندرستی اور عمر طبعی وغیرہ کا اندازہ لگایا جاتا ہے پھر مقررہ رقم پر معینہ مدت کے لئے ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت بیمہ کرنے والا طے شدہ رقم قسط وار کارپوریشن کو ادا کرتا رہتا ہے۔بیمہ زندگی کی دو قسمیں ہیں

۱- سالیانہ بیمہ (ANUITY INSURANCC)

۲- لائف انشورنش پالیسی LIFE INSURANCE POLICY

''سالیانہ'' میں بیمہ دار ایک مشت رقم کارپوریشن کو اس شرط پر دیتا ہے کہ وہ اس کو معینہ مدت کے بعد ایک معینہ مدت تک یا بیمہ دار کی زندگی تک پنشن کی طرح متفرق قسطوں میں یہ رقم دیتا رہے گا اگر مدت سے پہلے موت ہوگئی تو بقیہ رقم اس کے ورثاء کو ملے گی اور اگر مدت کے بعد زندہ رہا تو اس کو بدستور ماہانہ رقم ملتی رہے گی (اگرچہ جمع شدہ رقم سے زیادہ ہوجائے)

''لائف انشورنس پالیسی'' میں بیمہ دار دو قسم کی پالیسی خرید سکتا ہے۔

(الف) ''ہول لائف پالیسی'' ''WHOLE LIFE POLI CY'' اور

(ب) انڈومنٹ پالیسی ''ENDOWMENT POLICY''

''ہول لائف پالیسی'' میں بیمہ دار پریمیم (قسطوں کی رقم) زندگی بھر ادا کرتا اور موت کے بعد ورثا یا نامزدگان کو پالیسی کی رقم واپس کی جاتی ہے۔ ''انڈومنٹ پالیسی'' میں بیمہ دار ایک معینہ مدت تک بیمہ کی قسطیں (پریمیم) ادا کرتا اور پالیسی کے پختہ ہونے (مدت گزرنے) پر ساری رقم بیمہ دار کے ورثاء کو یا نامزدگان کو واپس ملتی ہے۔

بیمہ کی حقیقت واضح کرنے کے بعد مولانا نے اس کی شرعی حیثیت پر کلام کیا ہے اور اس کے جائز یا ناجائز کہنے والوں کے نام اور ان کے دلایل نقل کئے ہیں۔

قائلین جواز میں علامہ ابن عابدین شامی [۶۳] (۱۷۸۴-۱۸۳۶) مفتی عبدہ مصری (۱۸۴۹-۱۹۰۵) موسیٰ جار اللہ روسی ولادت ۱۲۹۴ھ فقیہ محمد یوسف موسیٰ (۱۸۹۹-۱۹۶۳م) استاذ احمد طٰہٰ السنوسی استاذ عبدالرحمٰن عیسیٰ، شیخ عبدالمنعم [۶۴] وغیرہ ہیں۔ عدم جواز کے قایلین میں مفتی محمد بخیت مطیعی مصری (۱۸۳۵-۱۸۵۴) شیخ عبدالرحمٰن قرادعہ، شیخ احمد ابراہیم، فقیہ ابوالحسن الجوی (وفات ۱۹۵۶ء) وغیرہ ہیں۔

قائلین جواز کے دلایل کا خلاصہ یہ ہے:

بیمہ کی غرض آمدنی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا ہے تاکہ وہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔ یہ

آمدنی کے پس انداز کرنے کا ایک اختیاری معاملہ ہے جس سے نہ زندگی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے اور نہ تقدیر کی مخالفت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کو ''تامین علی الحیاۃ'' کے نام سے موسوم کرنا غلط ہوتا ہے۔ بیمہ ایک جدید معاملہ ہے جس کا قرآن وسنت میں صراحتہً ذکر نہیں ہے لازمی طور سے اس کے حل کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہوگی جس کی دوصورتیں ہیں:

(الف) بیمہ کے نظام کو شریعت کے عمومی قوائد پر منطبق کر کے کسی ایسی نظیر پر قیاس کیا جو نص صریح سے ثابت ہو۔

(ب) بیمہ کے مصالح ومفاسد پر غور کر کے ان طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو غیر منصوص احکام میں اجتہاد کے لئے مقرر ہیں۔

شہری ضرورت سے جن معاملات کا تعلق ہے ان میں اجتہاد کا بنیادی اصول حصول مصالح اور دفع مضار ہونا چاہئے یعنی اگر ان سے نفع محض حاصل یا ان کے نقصان پر نفع کا غلبہ رہتا ہے تو مباح ہوں گے اور نقصان کا غلبہ ہے تو ناجائز ہوں گے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاضرر ولاضرار فی الاسلام۔

اسلام میں نہ نقصان اٹھانا اور نہ نقصان پہنچانا ہے۔

جبکہ عدم جواز کے قائلین کے دلایل کا خلاصہ یہ ہے!

''بیمہ'' چونکہ کسی قدیم عقد کے موافق یا مشابہ نہیں ہے اس بناء کسی کے ساتھ ملحق کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

بعض حضرات نے اس کو عقد مضاربت کے ساتھ ملحق کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے کیونکہ دونوں کے درمیان جوہری فرق ایسے رہ سکتی ہے مثلاً:

۱- مضاربت میں شرما ہے کہ نفع کی مقدار نسبت سے طے ہو اس کی تحدید وتعین نہ کی جائے جبکہ بیمہ میں نفع کی تحدید وتعین ہوتی ہے۔

۲- مضاربت میں اگر خسارہ ہوتو وہ صاحب سرمایہ کو برداشت کرنا پڑتا ہے جب کی بیمہ میں گویا صاحب سرمایہ کو خسارہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۳- مضاربت میں اگر صاحب سرمایہ کا انتقال ہوجائے تو اس کے وارث لگائے ہوئے سرمایہ کے حقدار ہوں گے زائد کے (بحثیت اصل سرمایہ) مستحق نہ ہوں گے جب کی بیمہ دار کے ورثاء طے شدہ رقم (زربیمہ) کے حقدار ہوں گے۔ خواہ کتنا ہی کم مقدار سرمایہ (قسط کی شکل میں) بیمہ دار نے لگایا ہو۔

۴- بیمہ مستقبل کے امکانی حادثات وناگہانی خطرات میں مالی کفالت کرتا ہے حالانکہ کسی عقد میں کفالت کی یہ شکل نہیں پائی جاتی۔

غرض ان وجوہات کی بناء پر بیمہ کو عقد مضاربت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ درج ذیل وجوہ کی بناء پر بیمہ ناجائز ہے۔

۱- اس میں جو پایا جاتا ہے کہ بیمہ دار مثلاً ۵۰ روپیہ کی ایک قسط ادا کرنے کے بعد انتقال کر جائے تو اس کے ورثاء یا نامزدگان زربیمہ کی پوری رقم پانے کے مستحق ہوتے ہیں جو جوئے کی ایک شکل ہے۔

۲- اس میں سود پایا جاتا ہے کہ اقساط کی شکل میں جس قدر رقم ادا کی جاتی ہے زربیمہ کی شکل میں اس سے زائد کی واپسی ہوتی ہے۔

۳- بعض صورتوں میں بیمہ دار کی رقم سوخت ہوجاتی ہے اور بعض میں ادا کی ہوئی رقم سے کم واپس ملتی ہے۔ مثلاً دوسال کا پریمیم ادا کرنے سے پہلے قسط دینا بند کردے دوسال کی ادائیگی کے بعد۔ پالیسی کو سرینڈر ''SURENDER'' کردے۔

۴- ایک معاملہ میں دو معاملہ:

(۱) بیمہ دار کا معاملہ

(۲) ورثا یا نامزدگان کا معاملہ کی شکل میں پائی جاتی ہے جس کی ممانعت ہے۔

۵- قانون میراث کی مخالفت پائی جاتی ہے کیونکہ نامزدگان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ وارث ہی ہوں غیر وارث بھی ہوتے ہیں۔

بہر حال جواز اور عدم جواز کی متنازعہ بحث کے بعد مولانا کا رجحان قائلین جواز کی طرف ہے اور یہ رجحان بے دلیل نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مولانا کے پاس اپنے دلایل ہیں مولانا فرماتے ہیں۔

بیمۂ زندگی کی عام ضرورت کے تحت جائز ہے اسے جن خرابیوں کی بنا پر ناجائز کہا جاتا ہے یہ ہیں:

۱- بیمہ کا تعلق رہن کی اس قسم سے ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔

۲- بیمہ میں تقدیر الٰہی سے مقابلہ اور قانون وراثت کا تعطل ہے۔

۳- بیمہ میں دھوکا اور سود پایا جاتا ہے۔

ہر ایک جوابات درج ذیل ہیں۔

۱- بیمہ کا تعلق رہن سے نہیں بلکہ امانت سے ہے یعنی کارپویشن بحیثیت ''امین'' زر بیمہ پر قابض ہوتا ہے۔

لیکن بیمہ کو امانت سے متعلق کرنے میں یہ اعتراض دار ہوتے ہیں۔

(ا) ''امین'' مال امانت میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں جب کہ کارپوریشن زر بیمہ میں آزادانہ تصرف کرتا ہے۔

(ب) حفاظت میں کوتاہی کے بغیر مال امانت تلف ہو جائے تو ''امین'' پر تاوان واجب نہیں جب کہ زر بیمہ تلف ہو جانے کی صورت میں بہر حال کارپوریشن پر ادائیگی واجب ہے۔

(ج) مال امانت جس قدر بھی ہو اس کی واپسی ضروری ہے جب کہ بیمہ میں دو سال کا پریمیم ادا کرنے سے پہلے بیمہ کو منقطع کیا جائے تو ادا شدہ پریمیم ضبط ہو جاتا ہے۔

(د) امانت میں جس قدر رقم حوالہ کی جاتی ہے بس اسی کی واپسی ضروری ہوتی ہے جبکہ بیمہ میں مدت مقررہ سے پہلے بیمہ دار کے انتقال کی صورت میں طے شدہ پوری رقم ورثاء کو دی جاتی ہے۔

(ر) مال امانت سے کارپوریشن ناجائز آمدنی (سود) بھی حاصل کرتا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

ان اعتراضات کے جواب ترتیب وار یہ ہیں:

(الف) امین کو مالک کی اجازت سے مال امانت میں تصرف کا حق حاصل ہے بیمہ میں معاہدہ کے ذریعہ کارپوریشن کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے۔

وان باذنہ اشترکا شرکۃ املاک۔

''امین'' اگر مالک کی اجازت سے امانت کو اپنے مال میں شریک کرلے تو دونوں کے درمیان شرکت ملکیت ہو جائے گی۔

اپنے مال میں شامل کرنے کے حق سے ضمنا تصرف کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شمولیت کے بعد تصرف میں امتیاز کرنا سخت دشوار ہے۔

(ب) حفاظت میں کوتاہی کے بغیر بھی ضمان واجب ہونے کی کئی صورتیں ہیں مثلاً اجازت کے بغیر شامل کرنے سے ضمان واجب ہوتا ہے۔

لو خلطها المودع بجنسها أو بغيره بماله او حال آخر بغير اذن المالك بحيث لاتتميز الابكافته۔

اگر امین نے مال امانت کو اس کی جنس یا غیر جنس کو اپنے مال یا غیر کے مال کے ساتھ مالک کی اجازت کے بغیر اس طرح شامل کرلیا کہ مشقت کے بغیر دونوں میں امتیاز نہیں ہوسکتا تو (تلف کی صورت میں) ضمان واجب ہوگا۔

عندالطلب مال نہ واپس کرنے سے ضمان واجب ہوتا ہے۔

فان طلبها صاحبها فمنعها وهو يقدر علیٰ تسلیمها ضمنها۔

اگر مالک نے مال طلب کیا اور قدرت کے باوجود ''امین'' نے مال واپس نہ کیا تو ضمان واجب ہوگا اجرت کے بدلہ امانت رکھنے سے ضمان واجب ہوتا ہے۔ **فلا یضمن بالهلاك الااذا كانت الوديعة بأجر** ۔اگر امانت اجرت کے بدلہ ہوتو تلف سے ضمان واجب ہوگا۔ بیمہ میں وجوب ضمان کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(الف) اجازت کے بعد تصرف کا حق صرف جائز امور تک محدود رہتا ہے جب کہ کارپوریشن اپنے کو جائز وناجائز ہر قسم کے تصرف کا مجاز سمجھتا ہے۔

(ب) رقم کی واپسی عندالطلب نہیں ہوتی بلکہ مدت مقررہ پر ہوتی ہے۔

(ج) کا جواب بیمۂ اموال میں گزر چکا ہے۔

(د) امداد باہمی کے اداروں میں بالعموم کسی کو کچھ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور کسی کو زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے لیکن کسی کو اعتراض کی گنجائش اس لئے نہیں ہوتی کہ معاہدہ کے ذریعہ پہلے ہی سب کچھ طے ہوجاتا ہے۔

(ج) معاہدہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے سزا کا مستحق ہوا اور ورثاء بیمہ دار کے انتقال کی وجہ سے ہمدردی کے مستحق ہوئے اس بناء پر (ج) کا سرمایہ ضبط ہوا اور (د) کو شدہ رقم سے زیادہ ملی۔

(ر) کارپوریشن زر بیمہ سے صرف ناجائز آمدنی نہیں حاصل کرتا بلکہ تجارت وکرایہ وغیرہ کے ذریعہ جائز آمدنی بھی حاصل کرتا ہے، ایسی صورت میں معاملت کے لئے غلبہ کا اعتبار ہے۔ چنانچہ عالمگیری میں ہے۔ ۶۵؎

لان اموال الناس لاتخلوا عن قليل حرام فالمعتبر الغالب۔

۱- لوگوں کے اموال میں کچھ نہ کچھ حرام ہوتا ہی ہے اس لئے غلبہ کا اعتبار ہے۔

۲- تقدیر الٰہی سے مقابلہ اس بناء پر نہیں کہ بیمہ میں حادثات وخطرات سے حفاظت کی ضمانت

نہیں ہوتی بلکہ تلافی نقصان کی ضمانت ہوتی ہے۔

اسی طرح قانون وراثت کے نفاذ کی ذمہ داری کارپوریشن پر نہیں بلکہ بیمہ دار اور اس کے ورثاء پر ہے، زر بیمہ کی واپسی کے بعد بھی قانون وراثت نافذ ہوسکتا ہے۔

۳- بیمہ میں جوا اور دھوکہ کا استعمال نہایت لغو ہے جیسا کہ مصطفیٰ زرقاء کے جواب میں گزر چکا ہے سود لینے پر بیمہ دار کو مجبور نہیں کیا جاتا غیر بونس (سود) والی پالیسی کا اختیار ہے۔

اس کے بعد مولانا بیع عرایا، بیع سلم، بیع عینیہ، بیع الوفاء ضمان درک اور ضمان خطر الطرق وغیرہ کی مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ معاملات اور مبادلات میں عدم جواز کی چند شکلیں پائی جانے کے باوجود ان کے جواز پر فتویٰ ہے۔ اسی طرح اگرچہ موجودہ دور کی بیمہ پالیسیوں میں ''سرمایہ داریت'' کے ''جراثیم'' پائے جاتے ہیں، اس لئے اس کو اسلامی بنانے کے لئے اسلامی حکومت کی ذمہ دار رہا ہے کہ سماجی تحفظات کی بہتر تنظیم کے لئے بیمہ پالیسیوں کو ان جراثیم سے پاک کرے جس کے لئے ضروری ہوگا کہ پرائیوٹ بیمہ کمپنیوں کو ختم کر کے سرکاری یا حکومتی بیمہ پالیسیوں کو بڑھاوا دیا جائے جو اس مقصد کے لئے زیادہ کارآمد ہوں گے۔

بہر حال موجودہ دور کی اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے مولانا نے حتی الوسع شریعت اسلامی کے نظائر اور فقہاء کرام کے علمی ذخیروں کی تلاش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہے اور موجودہ دور میں اس اہم ضرورت کی اسلامائزیش کے لئے مولانا کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۴- مفاہمت بین المذاہب

ہمارا معاشرہ ایک تکثیری معاشرہ ہے۔ بالخصوص سرزمین ہندوستان تو مذاہب کی کثرت کے لئے مشہور ہے اسلام، ہندوازم، سکھ ازم جین ازم، بدھ ازم مسیحیت اور یہودیت جیسے بڑے مذاہب کے ماننے والے لاکھوں کڑوروں کی تعداد میں یہاں بستے ہیں۔ اس پر لطف یہ ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا اپنے ہی مذہب کو سب سے اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے اور دوسرے کے مذہب کو غلط

سمجھتا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ ایک مذہب کو مان لینے کے بعد دوسرے مذہب کے لئے قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے مختلف مذاہب موجود تھے لیکن ان کے درمیان مفاہمت کی قطعاً گنجائش نہیں تھی۔

قرآن مجید سب سے پہلی کتاب ہے جس نے مفاہمت بین المذاہب کی بنیاد رکھی۔ اور چونکہ مولانا تقی امینیؒ صاحب کی نظر وقت کے مسائل پر بہت گہری تھی اس لئے یہ مسئلہ بھی مولانا کی نظر سے اوجھل نہ ہوا اور اس کی حل بنیاد مولانا نے قرآن مجید اور دیگر مصادر وشریعہ میں تلاش کی۔ مولانا کے نزدیک اس راہ کی مشکلات کو قرآن مجید نے درج ذیل طریقوں سے حل کیا:

۱۔ اعلان کیا کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

لااکراہ فی الدین۔۶۶

یعنی دین میں زور زبردستی نہیں ہے۔

۲۔ مذہب کی بنیاد تعلیم میں وحدت تسلیم کی۔ اور ان کی اصل کو مانا۔

کان الناس امۃواحدۃ فبعث اللہ النبین مبشرین ومنذرین وأنزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فی مااختلفوافیہ۔۶۷

لوگ ایک ہی اُمت (ایک دین) پر تھے پھر اللہ نے ان میں یکے بعد دیگر نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے اور ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ اللہ نے سچی کتاب اتاری تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کرنے والی ہو۔

۳۔ بنیادی تعلیم میں وحدت کے ساتھ مذہب کی مختلف شکلوں میں رواداری برتنے کا حکم دیا چنانچہ فرمایا:

ولاتسبواالذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوأبغیر علم۔۶۸

تم ان کو برا بھلا نہ کہو جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ورنہ وہ بے سمجھے بوجھے

حد سے تجاوز کر کے اللہ کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔

دوسری جگہ ہے:

لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعكم امة واحدةً ولكن ليبلوكم فی مااتاكم فأستبقوا الخيرات۔ ۲۹

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور طریقہ مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ اس نے جو تمہیں دیا ہے اس میں وہ تمہاری آزمائش کرے۔ پس نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرو

یہ آیتیں سابقہ شریعتوں کی تصدیق کرتی اور ان کے بارے میں رواداری کا حکم دیتی ہیں یعنی ہر امت کو ہم ایک شریعت (دستور العمل) دے چکے ہیں۔ آپ کو بھی ہم نے ایک شریعت دی ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس وقت کونسی شریعت بنیادی تعلیم سے ہم آہنگ اور قابل عمل ہے۔ دراصل اسی میں سب کی آزمائش اور اسی پر کامیابی کا انحصار ہے۔

ان آیتوں سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ سابقہ شریعتیں اصل میں موجود ہیں یا اب بھی حسب سابق وہ قابل عمل ہیں، بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ (رسولؐ اللہ) راہ راست پر ہیں آپ اپنی شریعت کی اتباع کیجئے۔ اور لوگوں کو بھی اس کی طرف دعوت دیجئے۔ سابقہ شریعتوں میں تبدیلی کا ذکر دوسری آیتوں میں ہے۔

چنانچہ اس حقیقت کو بڑی تفصیل کے ساتھ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا ہے اور دیگر شریعتوں کی اصولی اور اخلاقی باتوں کا تذکرہ نہایت تفصیل سے کیا ہے، نیز دیگر شریعتوں اور اسلام میں جو متفق علیہ امور ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں

اصل دین ایک ہے جس پر تمام انبیاء متفق ہیں البتہ شرائع اور منہاج میں اختلاف ہے اتفاق کی باتیں یہ ہیں عبادت واستقامت میں اللہ کو ایک سمجھنا، اس کی شان کے مطابق اس کی پاکی

بیان کرن اس کے ناموں میں کج روی کو حرام سمجھنا، اس کے شعایر کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرنا۔ اسی طرح نیکی کی قسموں پر سب نبیوں کا اتفاق ہے یعنی طہارت، صلوۃ، زکوۃ، روزہ، حج نفلی عبادات مثلاً دعا، ذکر اور تلاوت وغیرہ معاملات میں مثلاً نکاح کا جواز اور زنا کی حرمت، مجرموں پر حدود کا قیام دشمنوں سے جہاد کرنے اللہ کے دین کی اشاعت کی کوشش کرنا۔ یہ سب باتیں اصل دین ہیں اور ان پر سب کا اتفاق ہے البتہ شرائع اور منہاج میں نبیوں کا اختلاف رہا ہے یعنی احکام کی شکلیں مختلف رہی ہیں مثلاً موسیٰ کی شریعت میں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم تھا اور شریعت محمدی میں کعبہ کی طرف حکم ہے۔ موسیٰ کی شریعت میں زنا کی سزا صرف سنگساری تھی اور شریعت محمدی میں شادی شدہ کے لئے سنگساری اور غیر شادی شدہ کے لئے کوڑے مقرر ہیں۔ موسیٰ کی شریعت میں قتل کی سزا صرف قصاص تھی اور شریعت محمدی میں قصاص اور دیت (خون بہا) دونوں ہیں اسی طرح عبادات کے اوقات ارکان وآداب میں بھی اختلاف رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ نیکی کی مختلف قسموں اور نفع بند تدبیروں کو بروئے کار لانے کے لئے جو خاص ہئیت اور شکل بیان کی جاتی ہے اسی میں نبیوں کا اختلاف رہا اور اس کا نام شریعت ومنہاج ہے۔[۷۰]

مفاہمت بین المذاہب کو بروئے کار لانے کے لئے اسلام نے جو تدبیریں بتائی ہیں اس کی تفصیل مولانا یوں بیان فرماتے ہیں:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو آپس میں بھائی اور امت واحدہ قرار دیا:

الناس کلھم أخوة

سب لوگ بھائی بھائی ہیں۔

دوسری جگہ ہے: انھم امة واحدہ

وہ سب ایک امت ہیں۔

۲- ہر مذہب کے عبادت خانوں، عبادت کے طریقوں اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت کی گئی چنانچہ یہ حکم دیا گیا۔

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة وعلىٰ أن يضربوا نواقيسهم في اى ساعة شاء و امن ليل او نهار الافى اوقات الصلوٰة وعلىٰ ان يخرجوا الصلبان فى ايام عيد هم۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے عبادت خانے نہ گرائے جائیں۔ یہ لوگ رات اور دن میں جب چاہیں ناقوس بجائیں۔ البتہ نماز کے اوقات مستثنیٰ رہیں گے۔ یہ لوگ اپنی عید کے دن صلیب بھی نکال سکتے ہیں اسی قانون کا اثر تھا کہ۔ ۱۷۱ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ حکومت میں مصر کے گورنر موسیٰ بن عیسیٰ سے انہوں نے منہدم شدہ گرجوں کی حکومت کی جانب سے تعمیر کرانے کے متعلق علماء سے فتویٰ طلب کیا تو اس وقت کے سرکردہ عالم، لیث بن سعد اور عبداللہ بن لہیعۃ تھے ان حضرات نے گرجوں کی تعمیر کرانے کا علانیہ فتویٰ دیا۔ اور جواز میں نہایت دور رس دلیل پیش کی۔ علامہ مقریزیؒ تاریخی مصر میں لکھتے ہیں۔

فبنيت كلها بمشورة الليث بن سعدو عبدالله بن لهيعه وقالاهو من عمارات البلادو احتجابان الكنائس واستدل بانها لم تين الافى الاسلام فى زمن الصحابة والتابعين۔

عبداللہ بن لہیعہ اور لیث بن سعد کے مشورے سے کل عبادت خانے حکومت کی جانب سے بنادیئے گئے۔ ان دونوں نے کہا کہ یہ تو شہری عمارتیں ہیں اور دلیل پیش کی یہ سب اسلامی حکومت صحابہ اور تابعین کے زمانے میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ ۱۷

۳- ہر ایک مذہب کے ماننے والے کو نہ صرف اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی بلکہ ان کے دیگر رسوم ورواج کے ادائیگی کی مکمل اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ مشہور مورخ اور فقیہ ابوعبید اپنی کتاب الاموال میں رقم طراز ہیں۔

''وہ تمام ممالک جو غلبہ سے فتح کئے گئے تھے اُن کے باشندے اپنے مذہب اور شریعت پر باقی رکھے گئے تھے''

اور یہ آزادی ان کو یہاں تک حاصل تھی کہ اگر کوئی مسلمان غیر مسلموں کی شراب اور خنزیر کو بھی ضائع کر دے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ چنانچہ شام کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی میں ایک نسطوری راہب نے اپنے ایک دوست کے نام اپنے خط میں لکھا کہ:

''یہ طائی (عرب) جنہیں خدا نے آج کل حکومت عطا فرمائی ہے۔ وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں لیکن وہ عیسائی مذہب سے بالکل برسر پیکار نہیں ہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں کلیساؤں کو جاگیریں عنایت کرتے ہیں''

ان مذہبی آزادیوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اسلامی حکومت میں دوسرے مذاہب والے خود مختار وحدت میں تبدیل ہو کر مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست بن گئے۔ جیسا کہ پادری کارل یوفیسکی (C.KARALEVSKI) نے لکھا ہے۔

> ''علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے۔ یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا یہ تھی کہ انہوں نے ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک ''خود مختار وحدت'' قرار دیا اور اس مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اختیارات دیئے''

امام ابو یوسف کہتے ہیں:

صاروا أشداء علی عدو المسلمین وعونا للمسلمین علیٰ اعدآئھم۔

یہ لوگ مسلمانوں کے دشمنوں کے سب سے بڑے دشمن ہو گئے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کے بہترین مددگار ثابت ہوئے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اپنے دورِ عروج میں مختلف مذاہب کو جس قدر آزادی و سہولتیں دیں۔ موجودہ دور کی ترقی یافتہ سیکولر حکومتیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں، نیز ہر مذہب کو اپنی جگہ برقرار رکھ کر ''مفاہمت بین المذاہب'' کی جو راہ (وحدت دین) نکالی وہ موجودہ دور کی سیاسی راہ (وحدت ادیان) سے کہیں بلند اور قابل عمل ہے۔۲ے

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام میں مذہبی رواداری کا کیا مطلب ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام وحدت ادیان کا نہیں بلکہ وحدت انسانیت کا قابل ہے اسلام دن کو رات یا سفید کو سیاہ کہنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ حق کو حق کہنے کی تعلیم دیتا ہے انسانیت کی بھلائی اس میں نہیں ہے کہ مذاہب کی تعلیم کو بدل کر یا مذاہب کا آمیزہ تیار کر کے سب کو خوش کیا جائے جو بظاہر تو بڑی دل خوش کن بات ہے مگر عملاً شاید ہی کوئی اسے قبول کر سکے اس لئے اسلام نے مفاہمت بین المذاہب کی شکل یہی نکالی ہے کہ انسانیت کا خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق ہو مکمل احترام کیا جائے اور تمام مذاہب کو اساسی حیثیت سے ان کی اپنی حالت پر باقی رکھا جائے۔ اس تفصیل کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا منشاء یہی ہے تو اسلام میں غیر مسلموں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے، اور مرتد کو سزائے موت کیوں دی جاتی ہے نیز صدر اول میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان کے علاقوں سے کیوں جلاوطن کیا گیا؟

یہ غلط فہمیاں جان بوجھ کر اٹھائی گئیں تاکہ اس کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کیا جاسکے بہرحال اس کا جواب بھی مولانا نے پوری صراحت سے دیا ہے اور یہ پہلوان کی فقاہت کا عظیم ترین معیار ہے۔

جزیہ کے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

جزیہ دراصل جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ تھا کوئی مذہبی ٹیکس نہ تھا۔ اس زمانے میں جان و مال کی حفاظت کے لئے مقامی طور پر مستقل فوج رکھنے کی ضرورت ہوتی تھی جس کے اخراجات

کے لئے جزیہ نام کا ٹیکس وصول کرنے کا دستور قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا۔اسلام نے بھی اس دستور کو حالات کی مناسبت سے برقرار رکھا اور اگر کسی وجہ سے یہ حفاظت نہ ہوسکی تو وصول کیا ہوا ٹیکس (جزیہ) واپس کردیا گیا جیسا کہ ابو عبیدہ (گورنر) فرمانے شہر کے حاکموں کو یہ فرمان لکھا تھا۔

ان یردوا علیهم ماجبی لهم من الجزیة والخراج۔

جزیہ اور خراج کی رقم جو وصول کر چکے ہیں وہ واپس کردیں۔

اور یہ کہدیں کہ: ہم اس شرط کو نہ پورا کرسکیں گے جس کا ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔اب ہم اس کی قدرت نہیں رکھتے ہیں اس لئے جو کچھ وصول کیا ہے وہ واپس ہے اور ہم بدستور شرط کے پابند ہیں۔

اسی طرح غیر مسلموں میں سے جو لوگ فوج میں شریک ہوکر حفاظت میں مدد کرتے تھے ان سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا۔خود حضرت عمرؓ نے فوج میں شرکت کرنے والوں کے بارے میں عراق کے افسران کو لکھا تھا!

ارفعوا عنهم الجزاء ۔ان سے جزیہ ہٹادیا جائے گلب پاشا نے ٹیکس (جزیہ) کی واپسی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی کتاب میں لکھا ہے:-

"I can not remmber any other occaision in History when a goverment rerturned texes already Collected on. the ground that it had failed in its obligations".

۲- سزائے ارتداد جس کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پیدا کی گئیں ہیں ان کا جواب مولانا نے اس طرح دیا۔

''مرتد کی سزا کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ کفر وشرک اور اختلاف مذہب کی بنا پر تھی حالانکہ درج ذیل عبارتوں سے ظاہر ہے کہ یہ ظلم وزیادتی اور بغاوتوں کی بنا پر ہے۔فقہ کی مستند

کتابوں میں ہے:

ان القتل باعتبار المحاربة۔

قتل جنگ جوئی کے اعتبار سے ہے۔

دوسری جگہ ہے:

فیقتل لدفع المحاربة۔

قتل کیا جائے جنگ کے دفعیہ کی غرض سے

ایک اور جگہ ہے:

لان القتل لیس بجزآء علی الردة۔

اس وجہ سے کہ قتل مرتد ہونے کی سزا نہیں ہے۔

بلاشبہ اسلام میں کفر اور مذہب کی تبدیلی بڑا گناہ ہے لیکن یہ معاملہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے۔ حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے حکومت صرف بغاوت کی بنا پر سزا دے سکتی ہے جس میں مسلم اور غیر مسلم کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ جس کی طرف سے بھی بغاوت پائی جائے گی اس کے خلاف کاروائی ضروری ہوگی، جیسا کہ تاتاری اور مانعین زکوٰۃ اگرچہ مسلمان تھے لیکن ان کے خلاف جنگ کی گئی۔

وقتال التتازولومسلمین کالوا ھو قتل الصدیق مانعی الزکوٰۃ۔

تاتاریوں سے جنگ اگرچہ وہ مسلمان ہیں، ایسی ہی ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی جنگ مانعین زکوٰۃ سے تھی۔

یمن کے اکثر مانعین زکوٰۃ نے صرف زکوٰۃ سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ مرکز کو حوالہ کرنے سے انکار کیا تھا جو بغاوت کی ہی شکل ہے، اس بنا پر مسلمان ہونے کے باوجود ان سے جنگ کی گئی۔

جب دین میں زور زبردستی نہ ہونے کا اصول مسلم ہے تو تبدیلی مذہب کی بنا پر مرتد کو سزا دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۳- جہاں تک یہودیوں کی جلاوطنی کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں آنحضرتؐ کا یہ فرمان منقول ہے۔آپ نے فرمایا۔

أخر جوا الیہود من الحجاز وأخرجوا اھل النجران من جزیرہ العرب۔

یہودیوں کو حجاز سے نکال دو اور نجرانیوں کے جزیرۂ عرب سے نکال دو تو اس فرمان کے پیچھے بغاوت اور معاہدہ شکنی کا پس منظر ہے۔مزید برآں انہوں نے مسلمانوں کے دشمنوں سے سازشیں بھی شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے مملکت اسلامیہ کے وجود کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔چنانچہ ابوعبیدہ کتاب الاموال میں حضورؐ کے اس فرمان کی علت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رسولؐ اللہ نے ان کو نکالنے کا حکم اس لئے دیا تھا کیونکہ ان لوگوں نے عہد شکنی کی تھی۔یا صلح کے بعد کوئی اور نئی بات ان کی طرف سے پائی گئی تھی۔اور یہ حضرت عمرؓ کے اس خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے جلاوطن کرنے سے پہلے انہیں لکھا تھا۔

قاضی ابو یوسف نے منتقل کرنے کی وجہ یہ بیان کی ہے:

''حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کی جان و مال کا خطرہ تھا''

پھر ان کی مذکورہ حرکتوں کے باوجود ان کی جلاوطنی کے سلسلہ میں جو حکم نامہ بھیجا اس کے بعض دفعات ملاحظہ فرمائیے۔

۱- جس علاقہ میں اہل نجران جا کر آباد ہوں انہیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔

۲- مسلمان ان کے جان و مال کی پوری حفاظت کریں۔

۳- اگر ان پر کوئی ظلم کرے تو مسلمان آگے بڑھ کر ان کی مدافعت کریں۔

۴- اُن پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہ کی جائے

۵- سرکاری ٹیکس سے انہیں دو سال کی معافی دی جائے۔

اور یہ ساری سہولتیں ان کو ان کے علاقوں سے نکال کر مسلم علاقوں میں ہی بسانے کے لئے دی گئیں کسی اور حکومت کے حوالہ انہیں نہیں کیا گیا حالانکہ پڑوس ہی میں عیسائی حکومتیں موجود تھیں اسی طرح فدک والوں کی کھلی سازش اور معاہدوں کی خلاف ورزی کی تصدیق کے بعد حضرت عمرؓ نے جب انہیں وہاں سے منتقل کرنا چاہا تو پہلے زمین و جائداد کی مناسب قیمتیں لگا کر رقم ان کے حوالہ کی اور پھر چلے جانے کا حکم دیا۔[۴۷]

انصاف کیجئے آج کی کوئی حکومت بھی کیا اس طرح کا انصاف کرسکتی ہے آج کل تو صرف دہشت گردی اور بغاوت کا چارج لگتے ہی ملزم کی زندگی اور ساتھ ہی اُس کے اہل وعیال کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی جاتی ہے چاہے وہ بعد میں اس کیس سے معصوم ہی کیوں نہ بری ہو جائے۔ بہر حال یہ ہیں مولانا کے نزدیک مفاہمت بین المذاہب کی شکلیں ان میں نہ تو مسائل سے آنکھیں چرائی گئی ہیں نہ انہیں نظرانداز کیا گیا ہے بلکہ نہایت واضح انداز میں اسلامی تعلیمات کو بدلایل قاطعہ پیش کیا گیا ہے جو ایک گہری نظر اور عمیق بصیرت رکھنے والے فقیہ کے شایان شان ہے۔ ان سطروں پر ہم اپنا مقالہ ختم کرتے ہیں امید ہے اس کے ذریعہ مولانا کی فقہی بصارت وبصیرت کو واضح طور پر دکھانے میں ہم کامیاب ہو گئے ہوں گے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

حواشی

(۱) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ص ۱۷۔

(۲) حوالہ بالا، ص ۱۸، ۱۹۔

(۳) حوالہ بالا، ص ۱۹، ۲۰۔

(۴) حوالہ بالا، ص ۲۰۔

(۵) التعریف لأئمۃ التجدید بحوالہ مولانا عبیداللہ سندھی۔ (قلمی نسخہ)

(۶) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ص ۲۲

(۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۵۸، ۵۹ از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ مکتبہ فیض القران دیوبند ۱۹۹۶ء

(۸) المائدہ-۱

(۹) التلویح علیٰ التوضیح ص ۵۰۔

(۱۰) نورالانوار، ص ۲۴۶۔

(۱۱) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۷۱، ۷۲ از مولانا تقی امینی۔

(۱۲) حوالہ بالا ص ۷۲

(۱۳) اجتہاد کا تاریخی پس منظر ص ۱۵ از مولانا تقی امینی۔

(۱۴) ابواسحاق الشاطبی الموافقات ج ۴ ص ۸۹۔

(۱۵) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۱۱ از مولانا تقی امینی بحوالہ عقد الجید۔

(۱۶) ابن بدران الدمشقی کتاب المدخل الیٰ مذھب الامام احمد بن حنبل فصل عقد نضیدفی الاجتھاد و التقلیہ۔

(۱۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل، ص ۶۷ از مولانا تقی امینی۔

(۱۸) الفقہ الاسلامی آفاقة وتطورہ ص ۳۹ بند ۱۷ القیاس حسن محمد۔

(۱۹) الحشر۔۲

(۲۰) ابوبکر احمد بن ابی سھیل السرخسی اصول السرخسی ج ۲ باب القیاس۔

(۲۱) البقرہ، ع ۱۵۰۔

(۲۲) البخاری ج ۲ کتاب الاعتصام باب اجر الحاکم اذا اجتھد الخ......

(۲۳) السرخسی اصول ج ۲ فصل فی بیان طریق الرسول فی اظھار الشرع

(۲۴) النساء ع ۵

(۲۵) اجتہاد کا تاریخی پس منظر ص ۲۰، ۲۲ از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم وعرفان امین منزل۔

(۲۶) الشاطمی الامام ابواسحاق بن موسی 'الموافقات فی الصول الشریعة ج ۴ ص ۱۰۶

(۲۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۹ از مولانا تقی امینی۔

(۲۸) حوالۂ سابق ص ۲۳-۲۴۔

(۲۹) حوالۂ سابق ص ۲۶-۲۷۔

(۳۰) امام غزالی احیاء علوم الدین ج/۱، اللفظ الاول الفقہ۔

(۳۱) نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علیٰ العرف ص ۱۳۰۔

(۳۲) تقی امینی: احکام شرعیہ حالات وزمانہ کی رعایت ص۲۰،۲۱۔

(۳۳) حوالۂ بالا ص۲۲،۲۳۔

(۳۴) حوالۂ بالا ص۲۵،۲۶۔

(۳۵) الآمدی، احکام الاحکام ج/۳ص۱۶۶۔

(۳۶) علامہ رشید رضا المنار ج/۱۱ النسخ با قسامہ ص۴۱۴۔

(۳۷) تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت ص۳۲،۳۳۔

(۳۸) سورہ نحل (النحل) آیت-۹۰، رکوع-۱۸

(۳۹) المائدہ-۸

(۴۰) ابن قیم طریق الحکمہ ص۱۴۔

(۴۱) ابن قیم: اعلام الموقعین ج/۳ص۲۷۔

(۴۲) ابن قیم: اعلام م الموقعین ج۳،ص۵۴۳۔

(۴۳) سورہ زمریات-۶

(۴۴) سورہ دخان-۸۴

(۴۵) الشوریٰ-۳۸

(۴۶) آل عمران ع۱۵۹

(۴۷) سورہ النسا-۵۸

(۴۸) الحجرات-ع۱۳

(۴۹) البقرہ-ع۱۹۱

(۵۰) الزیلعی نصب الرأیہ ج ۳ کتاب السیر

(۵۱) السرخسی فی المبسوط ج/۱۰ص ۱۱۰۔

(۵۲) ابن قیم، اعلام الموقعین ص ۳۳۔

(۵۳) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۷۶، ۷۷

(۵۴) حوالہ بالا ص ۹۳

(۵۵) الحشر ع ۶ تا ۱۰

(۵۶) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۹۵ تا ۱۰۰

(۵۷) السرخسی فی المبسوط ج ۱ ص ۹۳

(۵۸) ابن حزم المالکی المحلی ج ۸ بحوالہ اسلام کا زرعی نظام ص ۱۳۱

(۵۹) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۳۵ تا ۱۳۷

(۶۰) حوالہ بالا ص ۱۳۷ تا ۱۳۹

(۶۱) حوالہ بالا ص ۱۵۴ تا ۱۵۵

(۶۲) حوالہ بالا ص ۱۵۹ تا ۱۶۰

(۶۳) شامی کے زمانہ میں بیمہ کی موجودہ شکل تو نہ پائی جاتی تھی صرف بحری بیمہ کی ایک شکل تھی جو دراصل فرانسیسی لفظ Securte کا معرّب ہے جس کے معنی آسان و اطمینان کے ہیں۔ شامی کے نزدیک بھی بیمہ دار الحرب میں جائز اور دار السلام میں ناجائز ہے۔

(۶۴) شیخ عبدالمنعم نے پرائیوٹ بیمہ کمپنیوں کو ناجائز جبکہ حکومت کی قائم کردہ تنظیموں سے بیمہ کو جائز قرار دیا ہے۔

(٦٥) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۲۴۵

(٦٦) البقرہ ع ۲۵٦

(٦٧) البقرہ ع ۲۱۳

(٦٨) الانعام ع ۱۰۹

(٦٩) المائدہ ۴۸

(٧٠) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ الدہلوی ج/ا باب بیان ان اصل الدین واحد والشرائع والمناهج مختلفه۔

(٧١) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۳۲، ۳۲۹۔

(٧٢) حوالۂ بالا ص ۳۲۹، ۳۳۱۔

(٧٣) حوالۂ سابق تلخیص صفحات ۳۳۱ تا ۳۳۵۔

مصادرومراجع

(الف) عربی

☆ القرآن المجید

☆ الصحیح البخاری الاما م محمد بن اسماعیل البخاری

☆ سنن الترمذی ابی عیسی محمد بن عیسیٰ بن سوره الترمذی

☆ سنن ابی داود لسلیمان بن الاشعث السجستانی

☆ الاسلام تشکیل جدید للحضاره محمد تقی امینی مترجم د/مقتدی حسین الازهری مراجعه و تقدیم د/عبدالحلیم عویس ط دارلعلوم للطباعة دانشر القاهره

☆ عصر الالحاد خلیفیته التاریخه و بدایة نهایتہ مراجعه و تقدیم عبدالحلیم عویس دارلصحوة للنشر و التوزلع القاهره

☆ کتاب الاموال لا بی عبیده القاسم بن سلام بتعلیق الشیخ حامد الفقی المکتبة التجاریه الکبریٰ بالقاهره

☆ کتاب الخراج لابی یوسف القاضی یعقوب بن ابراهیم الانصاری صاحب ابی حنیفه المطبعة السلفیه بالقاهره الطبعة الثانیه سنة (۱۳۵۲ھ)

☆ المبسوط للسرخسی لابی بکر محمد بن سهیل السرخیؒ مطبوع بثلاثین اجزاء من مطبعة السعادة بالقاهره

☆ القاموس المحیط لمجد الدین محمد بن یعقوب الفیروزآبادی مطبوع فی اربعة اجزاء بالمکتبه التجاریة القاهره

☆ المصباح المنير

☆ احيـاء علوم الدين للامام ابى حامد محمد الغزالى طبع فى اربعة مجلدات مع تخريج الحافظ العراقى بمطبعة الدارالقوميه للطباعة و النشر بمصر

☆ مسلـم الـثبوت به حاشيه التعليق المنعرت لمحب الله بن عبدالشكورالبهارى ط مصر

☆ الفقه الاسلامى آفاقه' وتطوره' للدكتور عباس حسنى محمد ط الْامانةُ العامّه لرابطة العالم الاسلامى بمكة المكرمة

☆ الـمـفـردات فـى غـريـب الـقرآن للراغب الاصفهانى (حسين بن محمد) طبع بمصر بتحقيق السيد احمد صقر سنة ١٩٥٨ء

☆ تفسير الخازن للشيخ علاءُ الدين على محمد بن ابراهيم البغدادى

☆ الأشباه و النظاير للحافظ جلاالدين السيوطى طبع بمصر

☆ منهاج الوصول الىٰ علم الاصول للبيضاوى مع تهذيب الدكتور شعبان محمد اسماعيل مكتبه جمهورية مصر ط ١٣٩٦ھ

☆ ميزان الاصول لعلاء الدين شمس النظير ابى بكر محمد بن احمد السمرقندى ادارة الشورة الاسلاميه بدولة قطر

☆ السـنة و مـكـا نتهـا فـى التشـريع الاسلامى للدكتور الشيخ مصطفىٰ السباعى المكتب السلامى بيروت ١٩٧٨ء

☆ تاريخ التشريع الاسلامى للاستاذ محمد خضرى بك طبع بمصر سنة ١٣٥٨ھ

☆ الـمدخل للفقه الاسلامى د/محمد سلام مدكور طبع بالدارالقوميه للطباعة و انشر بالقاهره سنة ١٩٦٤م

☆ التلويح علىٰ التوضيح سعد الدين مسعود بن عمر التفتازانی الشافعی

☆ الموافقات لابی اسحاق الشاطبی (ابراهيم بن موسیٰ) طبع بمصر فی اربع مجلدات

☆ كتاب المدخل الیٰ مذهب الامام احمد بن حنبل لا بن بدران الدمشقی

☆ احكام فی اصول الاحكام لعلی بن محمد الآمدی طبع فی اربعة اجزاء بيروت لبنان

☆ اعلام الموقعين عن رب العالمين لمحمد بن ابی بكر ابن قيم الجوزيه طبع فی اربعة اجزاء بمصر

☆ الفقه علیٰ المذاهب الاربعه

☆ المحلیٰ لابن حزم المالكی الظاهری المطبعة المنيريه بالقاهره ۱۳۵۲ھ

☆ حجة الله البالغه لشاه ولی الله الدهلوی دارالمكتب الحديثيه القاهره

(ب) اردو

☆ مراسلات علمی و دینی حصہ اول از مولانا محمد تقی امینی ناشر فیکلٹی آف دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اشاعت ۱۹۹۷ء

☆ مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی مرتب و سنہ اشاعت نامعلوم

☆ اسلام کا زرعی نظام از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم و عرفان اجمیر راجستھان

☆ مقالات امینی از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم و عرفان سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۷۲ء

☆ تہذیب جدید کی تشکیل از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۴ء

☆ حدیث کا درایتی معیار از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی سنہ طباعت ۱۹۸۰ء

☆ احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی سنہ طباعت ۱۹۷۰ء

☆ عروج وزوال کا الٰہی نظام از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء

☆ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی سنہ اشاعت ۱۹۶۵ء

☆ حکمت القرآن مطبوعہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

☆ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی

☆ اسلام اور جدید دور کے مسائل از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ مکتبہ فیض القرآن دیو بند سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء

☆ اجتہاد کا کا تاریخی پس منظر از مولانا محمد تقی امینی

(ج) رسائل وجرائد

☆ ماہنامہ معارف ترجمان دار المصنفین اعظم گڑھ شمارہ مارچ ۱۹۸۱ء

☆ ماہنامہ تہذیب الاخلاق جلد ۱۰ شمارہ جنوری فروری

حواشی

(۱) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ص ۱۷۔

(۲) حوالہ بالا، ص ۱۸، ۱۹۔

(۳) حوالہ بالا، ص ۱۹، ۲۰۔

(۴) حوالہ بالا، ص ۲۰۔

(۵) التعریف لأئمۃ التجدید بحوالہ مولانا عبید اللہ سندھی۔ (قلمی نسخہ)

(۶) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی ص ۲۲

(۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۵۸، ۵۹ از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ مکتبہ فیض القران دیوبند ۱۹۹۶ء

(۸) المائدہ-۱

(۹) التلویح علیٰ التوضیح ص ۵۰۔

(۱۰) نور الانوار، ص ۴۴۶۔

(۱۱) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۷۱، ۷۲ از مولانا تقی امینی۔

(۱۲) حوالہ بالا ص ۷۲

(۱۳) اجتہاد کا تاریخی پس منظر ص ۱۵ از مولانا تقی امینی۔

(۱۴) ابو اسحاق الشاطبی الموافقات ج ۴ ص ۸۹۔

(۱۵) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۱۱ از مولانا تقی امینی بحوالہ عقد الجید۔

(۱۶) ابن بدران الدمشقی کتاب المدخل الیٰ مذھب الامام احمد بن حنبل فصل عقد نضیدفی الاجتھاد و التقلیہ۔

(۱۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل، ص ۶۷ از مولانا تقی امینی۔

(۱۸) الفقہ الاسلامی آفاقة و تطورہ ص ۳۹ بند ۱۷ القیاس حسن محمد۔

(۱۹) الحشر-۲

(۲۰) ابوبکر احمد بن ابی سھیل السرخسی اصول السرخسی ج ۲ باب القیاس۔

(۲۱) البقرہ، ع ۱۵۰۔

(۲۲) البخاری ج ۲ کتاب الاعتصام باب اجر الحاکم اذا اجتھد الخ......

(۲۳) السرخسی اصول ج ۲ فصل فی بیان طریق الرسول فی اظھار الشرع

(۲۴) النساء ع ۵

(۲۵) اجتہاد کا تاریخی پس منظر ص ۲۰، ۲۲ از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم و عرفان امین منزل۔

(۲۶) الشاطمی الامام ابواسحاق بن موسی 'الموافقات فی الصول الشریعة ج ۴ ص ۱۰۶

(۲۷) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۹ از مولانا تقی امینی۔

(۲۸) حوالۂ سابق ص ۲۳-۲۴۔

(۲۹) حوالۂ سابق ص ۲۶-۲۷۔

(۳۰) امام غزالی احیاء علوم الدین ج/۱، اللفظ الاول الفقہ۔

(۳۱) نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علیٰ العرف ص ۱۳۰۔

(۳۲) تقی امینی: احکام شرعیہ حالات وزمانہ کی رعایت ص۲۰، ۲۱۔

(۳۳) حوالۂ بالا ص۲۲، ۲۳۔

(۳۴) حوالۂ بالا ص۲۵، ۲٦۔

(۳۵) الآمدی، احکام الاحکام ج/۳ص۱٦٦۔

(۳٦) علامہ رشید رضا المنار ج/۱۱ النسخ بأقسامہٖ ص۴۱۴۔

(۳۷) تقی امینی: احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت ص۳۲، ۳۳۔

(۳۸) سورہ نحل (النحل) آیت-۹۰، رکوع-۱۸

(۳۹) المائدہ-۸

(۴۰) ابن قیم طریق الحکمہ ص۱۴۔

(۴۱) ابن قیم: اعلام الموقعین ج/۳ص۲۷۔

(۴۲) ابن قیم: اعلام م الموقعین ج۳،ص۵۴۳۔

(۴۳) سورہ زمریات-٦

(۴۴) سورہ دخان-۸۴

(۴۵) الشوریٰ-۳۸

(۴٦) آل عمران ع۱۵۹

(۴۷) سورہ النسا-۵۸

(۴۸) الحجرات-ع۱۳

(۴۹) البقرہ-ع۱۹۱

(۵۰) الزیلعی نصب الرأیہ ج ۳ کتاب السیر

(۵۱) السرخسی فی المبسوط ج/۱۰ص۱۱۰۔

(۵۲) ابن قیم، اعلام الموقعین ص ۳۳۔

(۵۳) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۷۶، ۷۷

(۵۴) حوالہ بالا ص ۹۳

(۵۵) الحشر ۶ تا ۱۰

(۵۶) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۹۵ تا ۱۰۰

(۵۷) السرخسی فی المبسوط ج ۱ ص ۹۳

(۵۸) ابن حزم المالکی المحلی ج ۸ بحوالہ اسلام کا زرعی نظام ص ۱۳۱

(۵۹) تقی امینی: اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۱۳۵ تا ۱۳۷

(۶۰) حوالہ بالا ص ۱۳۷ تا ۱۳۹

(۶۱) حوالہ بالا ص ۱۵۴ تا ۱۵۵

(۶۲) حوالہ بالا ص ۱۵۹ تا ۱۶۰

(۶۳) شامی کے زمانہ میں بیمہ کی موجودہ شکل تو نہ پائی جاتی تھی صرف بحری بیمہ کی ایک شکل تھی جو دراصل فرانسیسی لفظ Securte کا معّرب ہے جس کے معنی آسان و اطمینان کے ہیں۔ شامی کے نزدیک بھی بیمہ دار الحرب میں جائز اور دار السلام میں ناجائز ہے۔

(۶۴) شیخ عبدالمنعم نے پرائیوٹ بیمہ کمپنیوں کو ناجائز جبکہ حکومت کی قائم کردہ تنظیموں سے بیمہ کو جائز قرار دیا ہے۔

(٦۵) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۲۴۵

(٦٦) البقرہ ع ۲۵٦

(٦۷) البقرہ ع ۲۱۳

(٦۸) الانعام ع ۱۰۹

(٦۹) المائدہ ۴۸

(۷۰) حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ الدہلوی ج/ا باب بیان ان اصل الدین واحد والشرائع والمناھج مختلفہ۔

(۷۱) اسلام اور جدید دور کے مسائل ص ۳۲، ۳۲۹۔

(۷۲) حوالۂ بالا ص ۳۲۹، ۳۳۱۔

(۷۳) حوالۂ سابق تلخیص صفحات ۳۳۱ تا ۳۳۵۔

مصادرومراجع

(الف) عربی

☆ القرآن المجید

☆ الصحیح البخاری الاما م محمد بن اسماعیل البخاری

☆ سنن الترمذی ابی عیسی محمد بن عیسیٰ بن سوره الترمذی

☆ سنن ابی داود لسلیمان بن الاشعث السجستانی

☆ الاسلام تشکیل جدید للحضاره محمد تقی امینی مترجم د/مقتدی حسین الازهری مراجعه و تقدیم د/عبدالحلیم عویس ط دارلعلوم للطباعة دانشر القاهره

☆ عصر الالحاد خلیفیته التاریخه و بدایة نهایتہ مراجعه و تقدیم عبدالحلیم عویس دارلصحوة للنشر و التوزلع القاهره

☆ کتاب الاموال لا بی عبیده القاسم بن سلام بتعلیق الشیخ حامد الفقی المکتبة التجاریه الکبریٰ بالقاهره

☆ کتاب الخراج لابی یوسف القاضی یعقوب بن ابراهیم الانصاری صاحب ابی حنیفه المطبعة السلفیه بالقاهره الطبعة الثانیه سنة (۱۳۵۲ھ)

☆ المبسوط للسرخسی لابی بکر محمد بن سهیل السرخیؒ مطبوع بثلاثین اجزاء من مطبعة السعادة بالقاهره

☆ القاموس المحیط لمجد الدین محمد بن یعقوب الفیروزآبادی مطبوع فی اربعة اجزاء بالمکتبه التجاریة القاهره

☆ المصباح المنير

☆ احيـاء علوم الدين للامام ابى حامد محمد الغزالى طبع فى اربعة مجلدات مع تخريج الحافظ العراقى بمطبعة الدارالقوميه للطباعة و النشر بمصر

☆ مسـلـم الـثبوت به حاشيه التعليق المنعرت لمحب الله بن عبدالشكورالبهارى ط مصر

☆ الفقه الاسلامى آفاقه' وتطوره' للدكتور عباس حسنى محمد ط الّامانۃ العامّه لرابطة العالم الاسلامى بمكة المكرمة

☆ الـمـفـردات فـى غـريـب الـقرآن للراغب الاصفهانى (حسين بن محمد) طبع بمصر بتحقيق السيد احمد صقر سنة ١٩٥٨ء

☆ تفسير الخازن للشيخ علاءُ الدين على محمد بن ابراهيم البغدادى

☆ الأشباه و النظاير للحافظ جلاالدين السيوطى طبع بمصر

☆ منهاج الوصول الىٰ علم الاصول للبيضاوى مع تهذيب الدكتور شعبان محمد اسماعيل مكتبه جمهورية مصر ط ١٣٩٦ھ

☆ ميزان الاصول لعلاء الدين شمس النظير ابى بكر محمد بن احمد السمرقندى ادارة الشورة الاسلاميه بدولة قطر

☆ السـنة و مـكـا نتهـا فـى التشـريع الاسلامى للدكتور الشيخ مصطفىٰ السباعى المكتب السلامى بيروت ١٩٧٨ء

☆ تاريخ التشريع الاسلامى للاستاذ محمد خضرى بك طبع بمصر سنة ١٣٥٨ھ

☆ الـمدخل للفقه الاسلامى د/محمد سلام مدكور طبع بالدارالقوميه للطباعة و انشر بالقاهره سنة ١٩٦٤م

☆ التلويح علىٰ التوضيح سعد الدين مسعود بن عمر التفتازانی الشافعی

☆ الموافقات لابی اسحاق الشاطبی (ابراهیم بن موسیٰ) طبع بمصر فی اربع مجلدات

☆ کتاب المدخل الیٰ مذهب الامام احمد بن حنبل لا بن بدران الدمشقی

☆ احکام فی اصول الاحکام لعلی بن محمد الآمدی طبع فی اربعة اجزاء بیروت لبنان

☆ اعلام الموقعین عن رب العالمین لمحمد بن ابی بکر ابن قیم الجوزیه طبع فی اربعة اجزاء بمصر

☆ الفقه علیٰ المذاهب الاربعه

☆ المحلیٰ لابن حزم المالکی الظاهری المطبعة المنیریه بالقاهره ۱۳۵۲ھ

☆ حجة الله البالغه لشاه ولی الله الدهلوی دارالمکتب الحدیثیه القاهره

(ب) اردو

☆ مراسلات علمی ودینی حصہ اول از مولانا محمد تقی امینی ناشر فیکلٹی آف دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اشاعت ۱۹۹۷ء

☆ مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی مرتب وسنہ اشاعت نامعلوم

☆ اسلام کا زرعی نظام از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم وعرفان اجمیر راجستھان

☆ مقالات امینی از مولانا تقی امینی ناشر ادارہ علم وعرفان سنہ اشاعت دسمبر ۱۹۷۲ء

☆ تہذیب جدید کی تشکیل از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۴ء

☆ حدیث کا درایتی معیار از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی سنہ طباعت ۱۹۸۰ء

☆ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی سنہ طباعت ۱۹۷۰ء

☆ عروج وزوال کا الٰہی نظام از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء

☆ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی سنہ اشاعت ۱۹۶۵ء

☆ حکمت القرآن مطبوعہ ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

☆ فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر از مولانا تقی امینی

☆ اسلام اور جدید دور کے مسائل از مولانا محمد تقی امینی شائع کردہ مکتبہ فیض القرآن دیوبند سنہ اشاعت ۱۹۹۹ء

☆ اجتہاد کا کا تاریخی پس منظر از مولانا محمد تقی امینی

(ج) رسائل وجرائد

☆ ماہنامہ معارف ترجمان دار المصنفین اعظم گڑھ شمارہ مارچ ۱۹۸۱ء

☆ ماہنامہ تہذیب الاخلاق جلد ۱۰ شمارہ جنوری فروری